راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19واں سال

Monthly
# Arxang
Lahore

ماہنامہ
# ارژنگ
لاہور

مدیراعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

جنوری 2018ء

مکتوب جاپان

# مشکور حسین یاؔد کی یادیں

عامر بن علی

زندگی تھوڑی سی بچی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آخری ملاقات میں یہ الفاظ تھے سید مشکور حسین یاؔد کے جو گزشتہ روز لاہور میں انتقال فرما گئے۔ نامور شاعر، خوبصورت ادیب اور منجھے ہوئے اسی صحافی نے 92 سال کی طویل عمر پائی۔ خدا کی رحمت سے آخری وقت تک چاک و چوبند اور تخلیقی کام میں مشغول رہے۔ وہ اردو شعر و ادب کا ایک ناقابل فراموش حوالہ ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف، اپنی تمام زندگی حرفوں کی تخلیق اور تدریس میں گزار گئے۔ صحافت سے ان کی وابستگی بہت پرانی تھی، جب پاکستان بنا تو 1947 میں بھی ایک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ربع صدی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا، جہاں سے ان کے ہزاروں شاگرد ہر شعبہ زندگی میں گئے۔ ان کے شاگردوں میں سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف سمیت بہت سے وزراء، افسران اور اہم حکومتی و غیر حکومتی افراد شامل ہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ مشکور حسین یاؔد کی زندگی کا آخری انٹرویو میں نے اور میرے ہم جماعت شاعر دوست عنبر عباس زیدی نے کیا تھا۔ سمن آباد کے علاقے ظفر کالونی میں ان کی رہائش گاہ پر خوب مزے کی طویل گپ شپ ہوئی۔ ہنسی، مذاق اور چٹکلے ان کی شخصیت کا یک خوبصورت پہلو تھا۔

ابتدائی زندگی کے بارے میں بتاتے تھے کہ میرے والد صاحب پولیس میں تھے۔ یہ 1925ء کی بات ہے، جب ان کی تعیناتی ضلع حصار (مشرقی پنجاب) کے علاقے بھٹنڈا میں تھی تو وہیں موضع منڈی ڈوالی میں میری پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم والد صاحب کی نوکری کے ساتھ چلی۔ سکول میں داخلہ دوسری جماعت میں لیا تھا۔ اس کے بعد سکول تبدیل ہوتے رہے مگر سب کے سب سرکاری سکول ہی تھے۔ میرے نانا اچھے خاصے ادیب اور توانا شاعر تھے۔ میرے خیال میں شاید ننھیال کی طرف سے شعر و سخن سے رغبت مجھ میں آئی ہے۔ مگر میرے دادا بھی لکھنے، پڑھنے سے متعلق آدمی تھے اور دادی تو لکھنو کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ پھینکا بیگم کے نام سے لوگ انہیں خوب پہنچانتے تھے۔ اس لحاظ سے میرا تعلق لکھنو سے بھی بنتا ہے۔ ویسے میرے خاندان کا تعلق ضلع مظفر نگر کے قریب بڑاؤلی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں کے علاوہ بھی ہمارے پاس تیس گاؤں تھے جو نواب صاحب نے دیے تھے۔ ہم اچھے خاصے جاگیر دار تھے۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا جب ضلع حصار میں واقع ہمارے سکول میں ترانہ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری تشریف لائے۔ انہوں نے مجھ سے غزل سنی اور داد دیتے ہوئے کہا کہ تم تو بہت زوردار شاعر ہو۔

اپنی پہلی کتاب کی اشاعت کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ وہ شاعری کی تھی، نثر کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ ایک درجن شعری مجموعوں کے خالق سید مشکور حسین یاؔد کو اردو انشائیے کا موخذ اور بانی کہا جاتا ہے۔ میں نے آخری ملاقات میں جب ان سے پوچھا کہ تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟ اس پر ان کا کہنا تھا کہ ذہین طلباء استاد کو پڑھانا سکھاتے ہیں۔ میں نے پچیس سال گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا اور ایک بھی ناغہ نہیں کیا، کوئی ایک کلاس بھی مس نہیں کی۔ یہ جو آجکل کہتے ہیں کہ شاگرد اپنے اساتذہ کی عزت نہیں کرتے، یہ بالکل غلط اور فضول بات ہے، استاد اپنے فرض کو نبھا کر تو دیکھے، شاگرد اب بھی عزت کرنے والے ہیں۔ عشق کی بابت میرے سوال پر ان کا کہنا تھا کہ بھائی! جس نے عشق نہیں کیا وہ تو بالکل گدھا ہے۔ ہم نے تو زندگی میں بہت سے عشق کیے ہیں۔ عشق کے بغیر تو انسان مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔ میں تو ہمیشہ ہی عشق کے لیے تیار ہوں۔ ان سے جب بھی میں نے ان کی گھنی زلفوں اور چستی کا راز پوچھا ٹال گئے۔ ایک دن ترنگ میں تھے، گھنے بالوں پر سوال کیا تو کہنے لگے، دراصل میرے ابا گنجے تھے، دادا بھی گنجے تھے، نانا بھی گنجے، حتیٰ کہ میری دادی اماں بھی گنجی تھیں۔ جوانی کے دنوں میں جب میں بال بناتا تو اماں طنز کرتیں کہ بیٹا یہ چند دن کے مہمان ہیں۔ پھر نہیں رہیں گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ اپنے بارے میں جیسا گمان کرتے ہیں ویسا ہی ہو جاتا ہے۔

گزشتہ صدی کی صحافت ہو یا پھر شعر و سخن، انجمن ترقی پسند مصنفین کے تذکرے کے بغیر مکمل تاریخ نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس متعلق ان کا کہنا تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے تمام سرکردہ لوگ میرے دوستوں میں شامل تھے، مگر کبھی اس تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں بنا۔ سچ بتاؤں تو ہم خود بڑے "پاٹے خان" تھے ان دنوں میں قیام پاکستان سے قبل ادبی منظر نامے پر نمایاں لوگوں میں مجھے جگر مرادآبادی زیادہ پسند تھے۔ باقی سب ادباء سے بھی ذاتی تعلق یوں تھا کہ میں اورینٹل کالج لاہور سے فارسی اور اردو زبان میں ایم فل کیا جہاں یہ سب لوگ آتے جاتے تھے۔ پارٹیشن کی یادیں البتہ یاؔد صاحب کی بہت پر درد تھیں۔ اپنے 35 اہل خانہ میں سے وہ واحد شخص تھے جو زندہ بچ کر پاکستان پہنچے تھے۔ بتاتے تھے کہ ضلع حصار سے جب ہم نکلے تو میری ماں،، بہن، بھائی، نانا، نانی سب مارے گئے۔ میں ان دنوں حصار میں ایک اخبار "پکار" کا ایڈیٹر تھا۔ ہمارا گھر ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا۔ بڑا اچھا علاقہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ محفوظ ہے۔ مگر بلوائی وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب بلوائی حملہ آور ہوئے تو میں زمین پر گر پڑا تھا، ٹھوکر لگی تھی۔ وہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں۔ سب اہل خانہ کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے تسلی کے لیے دوبارہ نیزے اور برچھیاں ماریں۔ اتفاق سے جب انہوں نے میرے نیزہ مارا تو وہ زمین میں پیوست ہو گیا۔ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے، پھر میں گرتا پڑتا لاہور پہنچ گیا۔

ممبئی بھی مشکور حسین یاد کا آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے پوچھا جناب سنا ہے کہ ایشوریا رائے آپ سے بے حد متاثر ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں! ہاں! ممبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پڑھنے لکھنے کی شوقین ہے۔ مگر ایشوریا رائے کو چھوڑو، ممبئی میں ہی میری گاندھی جی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ تھا۔ گاندی جی گورے چٹے آدمی تھے اور لڑکیوں میں گرے ہوئے تھے۔ میں نے سروجنی نائیڈو سے پوچھا کہ اس آتما کو مہاتما بنانے میں ان لڑکیوں کا کتنا حصہ ہے؟ اب اس طرح کی باتیں زندگی میں ان کانوں کو سننا کبھی بھی نصیب نہ ہوں گیں۔ مشکور حسین یاؔد ہی نہیں رہے، اور ان جیسا کوئی دوسرا تو ہے ہی نہیں۔

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

معروف شاعرہ

# لبنیٰ صفدر

کے مقبول عام شعری مجموعوں کے بعد تازہ شعری مجموعہ

## تم محبت کا استعارہ ہو

نہایت منفرد اور دیدہ زیب انداز میں اشاعت کے آخری مراحل میں

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ، اردو بازار ، لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

نامور شاعرہ، سفرنامہ نگار اور افسانہ نویس

# نیلما ناہید درانی

کا ادبی سفر

پاکستان میں سب سے زیادہ شاعری کی کتب شائع کرنے والا ادارہ

# نستعلیق
Publications

ہم کتاب کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں

کیونکہ ہمیں کتاب سے محبت ہے

مسودہ کی تیاری، کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ

ٹائٹل ڈیزائننگ، پیسٹنگ، طباعت، جلد بندی

تمام مراحل مکمل ذمہ داری اور پیشہ ورانہ تجربے کے ساتھ

خوبصورت کتاب کی اشاعت ایک آرٹ ہے

اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے آج ہی رابطہ کیجیے

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

# ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 جنوری 2018 شمارہ نمبر 1

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (چین)
محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ڈاکٹر سید ندیم حسین (ناروے) ◉ ناز اوکاڑوی

کمپوزنگ ● زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ● نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

**پتہ برائے خط وکتابت**

**ماہنامہ ارژنگ**

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
حسن عباسی : 0300-4489310 ناز اوکاڑوی : 0301-4492133
nastalique786@gmail.com

**سالانہ ممبرشپ**

ماہنامہ ”ارژنگ“ کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

## فہرست

حمد، نعت / ، ۲

مضامین:

- مطالعے کا نشہ / ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ، ۳
- عنبرین رفیق کا فنی تشخص / محمد افسر ساجد ، ۷
- رونق حیات کی باوبو غزلیں / نسیم سحر ، ۸
- باغِ سخن میں نئی بہار - ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر/ شاعر علی شاعر ، ۱۰
- میں جاناں لاہور / احمد سعید ، ۱۲

افسانے

- پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو / ڈاکٹر عطیہ سیّد ، ۱۳
- آل ان ون / حنیف سیّد، انڈیا ، ۱۹
- ڈائری ا-ا / انیلہ بھلر، امریکہ ، ۲۱
- گناہ گار / محمد حسنین صابر ، ۲۵

شعری گوشے:

- حسن عباس رضا ، افضل گوہر راؤ ، شاذ ملک ، عاکف غنی
عبید اللہ نزاکت ، ۲۶

سفرنامے

- ایشیا کا وینس / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ، ۳۱
- ارجنٹائن - خوابوں جیسی سرزمین / عامر بن علی ، ۳۹
- شاعری ، ۴۲
- بقیہ انٹرویو صہیب مرغوب ، ۴۵

مختصر ادبی خبریں ، ۵۲
تبصرۂ کتب ، ۵۳
نامہ ہائے احباب ، ۵۶

**Far East Marketing Co.**

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

# حمد، نعت

اندھیری شب میں ستاروں کو جگمگاتا ہے
وہی تو ہے جو ہمیں راستہ دکھاتا ہے
غم و خوشی پہ فقط اختیار ہے اس کا
کبھی کسی کو ہنساتا، کبھی رُلاتا ہے
کسی کے واسطے دولت بھی آزمائش ہے
کسی کو عسرت و غربت میں آزماتا ہے
اسی کے قبضہ قدرت میں ہے حیات وممات
وہی چراغ جلاتا وہی بجھاتا ہے
اسی کے ذکر سے مٹتی ہے تشنگی میری
اسی کا ذکر مری تشنگی بڑھاتا ہے
جو اس کے پاس چلا جائے پھر نہیں آتا
جو اس کے پاس سے آتا ہے لوٹ جاتا ہے
جو اس سے دور ہوا وہ ذلیل و خوار ہوا
قریب اس کے جو ہوتا ہے بار پاتا ہے
اسی کے ہاتھ میں خورشید کارِ دنیا ہے
بگاڑتا ہے وہی اور وہی بناتا ہے

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

---

خود کو جو حق کی محبت میں مٹا دیتا ہے
اس کے ہاتھوں میں خدا ارض وسما دیتا ہے
شرک کی آگ جو سینے سے بجھا دیتا ہے
اس کا دل ظلمت شب میں بھی ضیا دیتا ہے
میں کہ اس خالقِ کونین کے در کا ہوں فقیر
جو فقیروں کو شہنشاہ بنا دیتا ہے
اس کی اس نعمتِ عظمیٰ کو بیاں کیسے کروں
سانس لینے کو جو ہر وقت ہوا دیتا ہے
جو بھی سہتا ہے علالت جو شکیبائی سے
ایسے بیمار کو اللہ شفا دیتا ہے
یہ تو ہم ہیں کہ جو جاتے ہی نہیں اس کے قریب
وہ تو ہر وقت ہی بخشش کی صدا دیتا ہے
جو بھی ہو جاتا ہے اس ذات کا، اللہ اسے
اپنے دیدار کی صورت میں صلہ دیتا ہے
شکر میں اس کا تفاخر نہ کروں کیسے ادا
مجھ کو عزت جو محافل میں جدا دیتا ہے

تفاخر محمود گوندل/گجرات

---

لے جائے مجھے قسمت اُن راہ گزاروں میں
جنت کی جھلک دیکھوں طیبہ کے نظاروں میں
توصیف بیاں انؐ کی اک میں ہی نہیں کرتا
ہے مدح و ثنا ان کی قرآن کے پاروں میں
آقاؐ تمہیں بخشا ہے جو حسن مرے رب نے
وہ حُسن بھلا کب ہے ان چاند ستاروں میں
اکرام و عنایت کی ہے چشم کرم سب پر
ہر ایک بشر شامل ہے آپؐ کے پیاروں میں
ہر گوشۂ عالم سے، زائر تری دھرتی پر
آتے ہیں قطاروں میں جاتے ہیں قطاروں میں
سینوں میں محبت کے مہ تاب کیے روشن
جینے کے قرینے بھی سمجھائے اشاروں میں
اس کو بھی حضوری کا پیغام عطا کر دو
شامل ہے ندیم آقا! توصیف نگاروں میں

ریاض ندیم نیازی/سبی

---

خوشیوں کے نغمے گاؤ سرکار آ گئے ہیں
میلاد سب مناؤ سرکار آ گئے ہیں
سرکارِ دو جہاں کی آمد پہ عاشقو تم
راہوں میں دل بچھاؤ سرکار آ گئے ہیں
اب وقت آ گیا ہے مظلوم بے نواؤ!
خوش ہو کے غم سناؤ سرکار آ گئے ہیں
شہروں میں بستیوں میں کیا عید کا سماں ہے
سب قمقمے جلاؤ سرکار آ گئے ہیں
اے مفلسو! غریبو! بے آسرا یتیمو!
اب اشک مت بہاؤ سرکار آ گئے ہیں
مغموم رہنے والو دنیا کی اس فضا میں
دل میں نہ رنج لاؤ سرکار آ گئے ہیں
موسم ہے رحمتوں کا ساجد کی ہے گزارش
گھر بار سب سجاؤ سرکار آ گئے ہیں

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

---

خوشبو چمن کو ملتی ہے جس طرح پھول سے
یوں فیض پا رہا ہے زمانہ رسولؐ سے
ہے تیرا نامِ نامی ضمانت بہار کی
کھلتے ہیں سب چمن ترے قدموں کی دھول سے
وہ آج بھی جہاں میں پریشان حال ہیں
نسبت نہیں رہی جنہیں تیرے اصول سے
حاصل ہوا شرف نہ انہیں تیری دید کا
جتنے دکھائی دیتے ہیں چہرے ملول سے
جن پر تری نگاہ کا سایہ نہیں پڑا
وہ پھول بھی دکھائی دیے ہیں ببول سے
نزدیک ان کے آئے گی کیا منزلِ مراد
جو دور ہو گئے ہیں پیامِ رسولؐ سے

اقبال پیام/شجاع آباد

# مطالعے کا نشہ

اشفاق احمد ورک/شیخوپورہ

امریکہ کی سابق خاتونِ اول اور موجودہ وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن سے پاکستانی دوسرے کے دوران بے شمار "سوال" کرنے کے ساتھ ساتھ ایک سوال یہ بھی پوچھا گیا کہ آپ نے سیاسی، سماجی اور عالمی حوالے سے اتنا عروج دیکھا ہے، کیا دل میں اب بھی کوئی خواہش ہے جو پوری ہونا باقی ہے؟ خاتون وزیر نے برملا کہا: اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ سیاست سے جتنی جلدی ممکن ہو دست بردار ہو جاؤں اور بقیہ زندگی اپنی پسندیدہ کتب کے مطالعے میں صرف کر دوں۔

دوستو! صد شکر کہ امریکی خاتونِ اول کے خواب کی جو انتہا ہے وہ ہمارے معمولات کی ابتدا ہے۔ اس وقت عمر کے اُس مخمصے میں ہوں جہاں ۴۰ کا ہندسہ حالات و واقعات کی رنگین دھند میں غائب ہو چکا ہوتا ہے اور ۵۰ کا ہندسہ کسی سنگین حقیقت کی مانند اپنی جانب چہل قدمی کرتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طویل یا قلیل عمر میں زندگی کے دسترخوان سے اڑائے ہوئے بے شمار ذائقے مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہیں لیکن پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ ان میں کتاب سے بہتر ذائقہ کوئی نہیں۔ کتاب کی حمایت میں اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ قادرِ مطلق نے جب بھی اپنی اشرف مخلوق سے مخاطب ہونا چاہا ہمیشہ کتاب کا سہارا لیا۔

وہ جو ضرب المثل ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ اسی کے مصداق بعض احباب کی مہربانی سے ہر مہینے کتب و رسائل کی شکل میں شکر کی مناسب مقدار ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ رہی سہی کسر کتب خانوں، کتب میلوں یا اردو بازار کا پھیرا لگانے سے پوری ہو جاتی ہے۔ مرحوم جعفر بلوچ فرمایا کرتے تھے کہ: اُردو کا پروفیسر اردو بازار نہیں جائے گا تو اور کہاں جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ پڑھنا ہمارے لئے سب سے بڑی عیاشی اور لکھنا مشقت ہے۔ عیاشی کے اس تین دہائیوں پر پھیلے سلسلے پہ نگاہ دوڑاتا ہوں تو گاؤں کا وہ کچا کمرہ یاد آ جاتا ہے جس کی دیوار میں کیل ٹھونک کر مٹی کے تیل والی لالٹین آویزاں کرتا تھا اور پھر بیٹھ ٹھونک کر نسیم حجازی، ابنِ صفی یا شفیق الرحمٰن وغیرہ کی کسی کتاب کے درپے ہو جایا کرتا تھا اور اگلے دن گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کا تند مزاج لائبریرین ایک نظر وسیع و عریض ناول اور دوسری نظر ہمارے محدود سراپے پر ڈال کر ٹرش لہجے میں پوچھتا تھا:

"توں ساری کتاب اِکو دن چ پڑھ لئی اے؟"

آج بھی یہ عیاشی ڈرائنگ روم، بیڈ روم، سٹڈی روم، کالج آفس اور گاڑی میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ البتہ مشقت کے سلسلے میں ہمارا رویہ عین مین اپنی قوم والا ہی رہا ہے۔ گزشتہ دنوں جناب مشتاق احمد یوسفی کی زبان سے کسی انگریز مصنف کا ایک جملہ سنا جس نے ہمارے مطالعے سے حاصل ہونے والے اطمینانِ قلب کو اچھا خاصا جھٹکا دیا ہے، جملہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"جو شخص چار لائنیں سیدھی لکھ سکتا ہے، اگر اس کو محض مطالعے میں مزا آنے لگے تو سمجھیں کہ حرام خوری پر اتر آیا ہے۔"(۱)

دوستو! اسی مبینہ حرام خوری سے بچنے کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے مطالعے کی رسید احباب تک ضرور پہنچنی چاہئے۔ کتب کے بارے میں رائے اور انداز سراسر ہمارا ذاتی ہوگا۔ اگر کہیں چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی چل نکلے تو مقصد دلداری سمجھا جائے۔ دل آزاری نہیں۔

اپنے مطالعے کے سلسلے میں ایک بات کا اعتراف کرنا ہم از حد ضروری سمجھتے ہیں کہ جس چیز نے تسلسل کے ساتھ ہماری روح کو بالیدگی اور زمینی و زمانی حوالے سے فرحت بخشی ہے وہ گزشتہ بیس برس سے کیا جانے والا قرآن مجید کا بلا ناغہ مطالعہ ہے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک رکوع کے بامفہوم مطالعے نے ہمیں جو رہنمائی، سرشاری اور استقامت عطا کی ہے، اس کا دوسرا تصور بھی محال ہے۔ یہ ہماری قومی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ آج ہم قرآنی آیات سے منہ موڑ کر طرح طرح کی قدرتی آفات اور عالمی نکبت کا شکار ہیں۔

گرمیوں کی تعطیلات، محکمہ تعلیم سے منسلک لوگوں کے لئے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتیں۔ ہمارے بہت سے احباب ان تعطیلات میں پیپر مارکنگ، امتحانی ڈیوٹیوں، سٹاک ایکسچینج، پراپرٹی ڈیلنگ کے ذریعے لاکھوں کماتے ہیں۔ پیپر سیٹنگ اور مارکنگ کی حد تک تو یہ جوا کچھ سالوں سے ہماری نازک گردن پر بھی نہایت شدت سے کسا ہوا تھا، لیکن اس بار شعبہ اردو کلیہ شرقیہ، جامعہ پنجاب کے تازہ ترین چیئرمین اور استادِ محترم جناب ڈاکٹر فخر الحق نوری صاحب کی خصوصی شفقت کی بنا پر ہم اس شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اب کے یہ تعطیلات ہمارے لئے رنگا رنگ کتب کے خوش گوار اور لا محدود مطالعے کی جاں فزا نوید لے کر نازل ہوئیں۔ ان میں سے چند کتب کا ہم ذیل میں، جستہ

جستہ لئے گئے نوٹس، کہیں کہیں لگائے گئے کچی پنسل کے نشانات اور حافظے کی سلیٹ پہ بننے والے کچھ نقوش کی مدد سے تذکرہ کرتے ہیں:

### ۱۔ زندگی سے لطف اٹھائیے! (۲)

یہ کتاب ''استمتع حیاتک'' عربی کے معروف سکالر ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن العریفی کے لطفِ قلم کا شاہکار ہے جو عربی میں دس لاکھ سے زیادہ تعداد میں چھپ کے دنیا بھر کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کا خوبصورت اردو ترجمہ حافظ قمر حسن نے کیا ہے۔ اس کے طباعتی حسن کی ذمہ داری کتاب و سنت کی اشاعت کے عالمی ادارے دارالسلام نے حسبِ روایت نہایت سلیقے سے نبھائی ہے۔ کتاب اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں کامیاب زندگی گزارنے کے سنہری اصولوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ امتِ مسلمہ کے تمام چھوٹے بڑے مسائل کا حل رسول اللہ کی سیرتِ پاک میں موجود ہے اور بلا شبہ آپ کی زندگی ہمارے لئے نمونہ اور باعثِ تقلید ہے۔ زندگی میں کسی طرح کا بھی مسئلہ درپیش ہو، اس کا آسان اور قابلِ عمل حل تو تھوڑی سی تلاش کے بعد آپ کی سیرت میں مل جائے گا۔ کتاب کے مصنف نے یہی کام نہایت قرینے اور دلچسپی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ دشوار گزار زندگی کو کس طرح خوش گوار اور پُرمسرت بنایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ آپ کو یقیناً ڈینگی جیسے مسائل اور ڈیل کارینگی جیسے مسائل شناسی کے دعویداروں سے بھی بے نیاز کر دے گا، جو دوسروں کو راہنمائی فراہم کرتے کرتے اپنے آپ کو خودکشی سے نہ بچا سکا۔ کتاب ناول سے زیادہ دلچسپ، سوانح سے زیادہ قابلِ عمل اور تاریخ سے زیادہ رنگا رنگ ہے۔

### ۲۔ اسلام اور خانقاہی نظام: (۳)

یہ بھی مکتبہ دارالسلام کی پیش کش ہے اور ظاہری و معنوی حسن سے سرتا سر مملو۔ اس کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ بھٹی ہیں۔ جنہوں نے دینی و قرآنی حقائق کی روشنی میں تصوف اور خانقاہی نظام کی تاریخ، انداز، قسمیں اور اثرات کا ایک معاشرتی محقق کے انداز میں جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں نگار خانۂ حیرت ہے۔ جس میں ہندی مسلم کی مذہب کے نام پر سامنے آنے والی جذباتی موشگافیوں کو حقیقت کے آئینے میں دکھانے کی خوب صورت کاوش کی گئی ہے۔ حقیقتِ مطلق کے متلاشی لوگوں کے لئے یہ نہایت چشم کشا دستاویز ہے۔

### ۳۔ لوحِ ایام (۴)

ہمیں تسلیم کہ جناب مختار مسعود کا یہ ادبی دھاکہ جنوری ۱۹۹۶ء میں رونما ہوا تھا، اور ہمارے بک ریک میں اس کا ورود ۲۰۰۱ء میں ہو گیا تھا لیکن کارِ جہاں اور قعرِ زماں کا کیا کیجئے کہ اس نے ہمارے ارادے اور استفادے میں دس سال کی دراڑ ڈال دی...... لیکن دوستو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں کیوں کہ ہم ایک ایسے کاہل شخص کو بھی جانتے ہیں جس نے ۱۹۹۰ء میں ہماری آنکھوں کے سامنے جناب مشتاق احمد یوسفی کی ''آبِ گم'' خریدی۔ ایک ہفتے میں پڑھ کر تفصیلی تبصرہ بھی لکھ ڈالا۔ کتاب سرہانے والے ریک میں اس نیت سے رکھ دی کہ اسکی بہتر تفہیم اور لطفِ مکرر کے لئے اسے دوبارہ پڑھوں گا۔ کچھ سالوں بعد اسی کتاب کے نئے ایڈیشن کا ایک نسخہ خرید کے دفتر میں لے گئے کہ جہاں سے بھی موقع ملا مطالعے کا آغاز کر دیں گے لیکن آخری خبریں آنے تک اس کارِ خیر کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب آپ کو کیا بتلائیں کہ وہ کاہل مطلق شخص بھی ہم خود ہی ہیں۔

مختار مسعود کے اسلوب کا جادو ''آوازِ دوست'' کی صورت میں اردو ادب کے ہر سنجیدہ قاری کے سر چڑھ کے بولا تھا۔ پھر ''سفر نصیب'' کی گونج سنائی دیتی رہی۔ سب سے آخر میں ''لوحِ ایام'' رقم ہوئی۔ یہ اصل میں انقلابِ ایران کی عبرت انگیز اور ادب آمیز دستاویز ہے۔ یہ کتاب چشم دید واقعات اور چشم کشا تجربات سے بھری پڑی ہے۔ مذکورہ بالا تینوں گواہ ہیں کہ مختار مسعود صاحب کا قلم ہمیشہ چوکھی لڑتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب اور حالاتِ حاضرہ کی مشترکہ تھاپ کے بغیر ان کے لفظ، رقصِ آغاز نہیں کرتے۔ یہ مختار مسعود جیسا نقطہ شناس اور باریک بین ہی بتا سکتا تھا کہ احوال پُرسی سے مراد علاقے کا حال جاننا ہوتا ہے۔ مزاج پرسی صحت مند سے کی جاتی ہے۔ مریض کے لئے بیمار پرسی کی اصطلاح مخصوص ہے۔ بے یارو مددگاری میں کسمپرسی سے مدلی جاتی ہے اور جس معاملے میں سب سے رائے لی جائے وہ ہمہ پُرسی کی ذیل میں آ جاتا ہے۔ انگریزی میں یہی referendum ہے۔

یقین کریں مجھے تو یہ کتب پڑھ کے پتہ چلا کہ ایران میں چاند گرہن (ماہ گرفتہ) کا مثبت مفہوم لیا جاتا ہے یعنی چاند کو اپنی گرفت میں لے لینے والا اور وہاں خوبصورت لڑکیوں کے لئے یہ دل پسند نام ہے۔ یہ بھی مزے دار ہے۔ کہ فارسی میں بے کار: کام نہ کرنے والا اور بے گار: اجرت کے بغیر کام کرنے کو کہا جاتا ہے۔ دستک اور تالی ہم معنی ہیں۔ وہاں سائیکل کو دو چرخہ کہا جاتا ہے۔ روٹی کا کنارہ، لب نان ہے، نومولود وہاں جدید الورود ہے اور فٹ نوٹ کے لئے پاورقی استعمال ہوتا ہے۔ کال گرل کو وہاں فاحشہ تلفونی کہا جاتا ہے اور ہمارے سیاستدانوں کو برا بھلا بہت کچھ کہا جاتا ہے...... جی ہاں یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہمارے حکمرانوں کے اللوں تللوں کو پوری دنیا میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی

میں سنا ہے کہ ہمارے وزیراعظم بغل میں کشکول اور جلو میں اسی اوباش مسکینوں کو لے کے امریکہ یاترا پر روانہ ہونے والے تھے۔ یاتریوں کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں کمرے اور لیموزین گاڑیاں بک کروالی گئیں تھیں۔ وہ تو بھلا ہو باراک اوباما کا جس کو عین موقع پر شرم آگئی۔ اور ہماری بے کسی کی لاج رہ گئی۔ ہمارے حکمرانوں کی یہ غیرت کوئی آج رفو چکر نہیں ہوئی بلکہ جمہوریت کی سب سے بڑی دعوے دار جماعت کے ''شہید'' لیڈر کا حال جناب مختار مسعود کی زبان سے سنیئے:

''آج کل ان دو بڑے گھروں میں جو اسلام آباد میں پہاڑی پر بنے ہوئے ہیں کم و بیش چار سو خدمت گاران کی ناز برداری میں لگے ہوئے ہیں، جو اپنے آپ کو ملک، قوم اور عوام کا خادم کہتے ہیں...... صرف وزیراعظم کے کچن میں چار ہیڈ کک ہیں، کچن میں بتیس افراد کا عملہ ہے، اس کے علاوہ چار ڈاکٹر ہیں، ایک آدمی اس کام پر مامور ہے کہ وہ صاحب پر کھانا کھاتے ہوئے نظر رکھے کہ انہیں کون سا کھانا مرغوب یا نامرغوب ہے۔''(۵)

مختار مسعود تجزیہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں، انہیں احساس ہے کہ زندہ قومیں عمل اور جرأت سے پہچانی جاتی ہیں معدوں اور معاہدوں سے نہیں۔ وہ موازنے کے لئے بانئ پاکستان کی مثال پیش کرتے ہیں:

''زیارت میں قیام کے دوران ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے قائداعظم کی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو دو باورچی کپورتھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں انہیں زیارت بھیجا جائے کیوں کہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائد کو مرغوب ہے۔ باورچی زیارت پہنچے، کھانا پکایا۔ اس روز قائداعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو بلایا۔ کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی، وجہ بتائی گئی وہ ناخوش ہوئے۔ چیک بک منگوائی، باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا، اس رقم کا چیک کاٹا، رقم سرکاری خانے میں جمع کرائی، باورچی رخصت کیے اور کہا ''یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا سرکاری خرچ پر فراہم کرے۔''(۶)

شاعر مشرق نے سچ کہا تھا کہ ؎

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

اور مختار مسعود کا یہ قول بجا کہ: ''اسراف جرم ہے اور غربت میں اسراف دہرا جرم ہے۔''(۷)

## ۲۔ صد شعرِ غالب: (۸)

دوستو! ہمارے ہاں کسی شخص کے نام کے ساتھ ''بریگیڈیئر'' کا سابقہ بھی موجود ہو اور وہ سچ مچ کا وزیر بھی رہ چکا ہو تو اس سے کسی غلط فہمی کی امید تو رکھی جا سکتی ہے، غالب فہمی کی ہرگز نہیں۔ ان دونوں طبقوں کا لفظ غالب سے تعلق تو سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا ہمیشہ اقتدار پہ غلبہ رہا ہے لیکن شاعر غالب سے تو ان کا دور کا واسطہ بھی نظر نہیں آتا۔ غالب تو ایسا جمہوریت پسند اور عجیب و غریب شخص تھا کہ پیشۂ آبا کی سپہ گری پہ فخر کرتا تھا اور فوج سے دور بھاگتا تھا۔ بقول ایک بھیدی کے وہ کہا کرتا تھا ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آرمی سے کہ جنرل گزیدہ ہوں

ہمیں تو حیرت اس بات پر بھی ہے کہ حضرت مصنف جن دو شعبوں سے وابستگی کا دعویٰ کرتے ہیں وہاں تو ہر وقت تکبر کے بھیڑیے، نخوت کے مگر مچھ اور حمق کے اژدھے منہ کھولے کھڑے رہتے ہیں، ان حالات میں یہ عاجزی، انکسار، خاکساری، صلح جوئی اور علمی جستجو کی فاختاؤں کو بچا لانے میں کیسے کامیاب ہوگئے؟

کتاب کے سرِ ورق پہ نظر کریں تو امجد اسلام امجد کا وہ مصرع یاد آ جاتا ہے:

وہ راہ چلتی تو ایسے لگتا کہ جیسے چاندی پگھل رہی ہے

جی ہاں قارئین! سرِ ورق کا رنگ پگھلی ہوئی چاندی جیسا ہے، جس کے اوپر مرزا نوشہ اپنی ٹھسے دار ترکی ٹوپی کے ساتھ براجمان ہیں۔ کتاب کے اندر تصاویرِ بتاں اور حسینوں کے ''خطوط'' کی داستاں ورق ورق بکھری پڑی ہے۔ کتاب کے میمنہ میسرہ میں جناب محمد علی صدیقی، جناب ڈاکٹر خواجہ زکریا، جناب ڈاکٹر وحید قریشی، جناب ڈاکٹر وزیر آغا اور جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ہم جیسے منہ پھٹ تبصرہ نگاروں کی سٹی گم کرنے کے لئے موجود ہیں...... کتاب کی اشاعت و طباعت و تزئین میں ایک بریگیڈیئر کا طنطنہ اور وزیر کی آن بان ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں۔ یقین کریں اگر غالب کو ان کی زندگی میں ایسی عمدہ کتاب کی اشاعت کی نوید سنائی جاتی تو وہ برملا کہہ اٹھتے ؎

ہم خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کتاب کا سب سے روح افزا پہلو یہ ہے کہ ہم جیسے ہی کتاب کی ورق گردانی شروع کرتے ہیں، وزیر اور بریگیڈیئر چپکے سے کہیں سنک جاتے ہیں اور ایک عالم حامد سعید ہمارے ساتھ چل پڑتے ہیں اور مفہوم و معانی کی ایسی ایسی پرتیں کھولتے جاتے ہیں کہ احساس ہوتا ہے ابھی افکارِ غالب کی کتنی کھدائی باقی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں شیخوپورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ایک دم پنجاب یونیورسٹی

کے شعبہ اردو میں جا داخل ہوا تو ہوتے ہوتے یہ خبر میری دادی اماں تک بھی جا پہنچی کہ میرے کالج میں ''جوان'' لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ دادی جان نے آس پاس اور آخر میں مجھ سے تصدیق کرنے کے بعد کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا:

''توبہ توبہ قیامت دیاں نشانیاں نیں۔''

تو دوستو! آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ جب کسی کو اچانک پتہ چلے کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر کے پچاس ساٹھ شارحین میں سب سے آگے نکل جانے والا کوئی فوجی یا وزیر ہے تو کیا اس کے منہ سے بے ساختہ یہ نہیں نکلے گا کہ:

''توبہ توبہ قیامت دیاں نشانیاں نیں۔''

۹۔ ماہِ منور (۹)

ڈاکٹر رؤف امیر، صحیح معنوں میں ایک سیلف میڈ آدمی (اب اہل علم بتائیں گے کہ اس کے لئے خود ساختہ کی ترکیب استعمال کی جا سکتی ہے کہ نہیں) واہ فیکٹری میں ایک مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوئے۔ ساری تعلیم بھاگتے دوڑتے حاصل کی اور ہوتے ہوتے الماتی، قزاقستان کی ابلائی خاں یونیورسٹی میں اسکالر پاکستان چیئر کے عہدے تک جا پہنچے۔ رؤف امیر ادیب، شاعر، استاد اور یار باش آدمی تھے۔ گورڈن کالج راولپنڈی میں جناب انور مسعود کے کولیگ اور بے تکلف دوست رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان دونوں احباب سے میری پہلی ملاقات لاہور میں الحمد پبلی کیشنز پہ ہوئی جہاں رؤف امیر کا پہلا شعری مجموعہ ''درِنیم وا'' چھپ رہا تھا۔

جناب انور مسعود بے پناہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جملہ بازی اور برجستہ گوئی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک نظم مکمل کی، ہمیں سنائی، پھر اس کے عنوان پہ غور کرنے لگے، سوچتے سوچتے ایک دم بولے: ''اشفاق توں ای ایہدا ناں رکھ، تیری وی تے بھتیجی لگدی اے۔''

اسی محفل میں انہوں نے رؤف امیر کو مخاطب کر کے برجستہ شعر کہا:

رؤف امیرا، توں کلیاں ای مرجانا ایں (۱۰)

پھر اپنے چہرے پہ مخصوص شریر ڈرامائی کیفیت طاری کرتے ہوئے دوسرا مصرع پڑھا:

او خنزیرا، توں کلیاں ای مرجانا ایں

احباب سے گزارش ہے کہ اس شعر سے ان کا دھیان قافیے کی طرف نہیں، بے تکلفی کے اس درجے کی طرف جانا چاہئے، جو ان دونوں احباب کے درمیان موجود تھا...... مذکورہ کتاب اسی بے تکلفی، محبت، خلوص اور تعلق کی داستان ہے، جس کے لفظ لفظ سے اپنائیت کا احساس ابھرتا ہے۔ ڈاکٹر رؤف کتاب کے دیباچے کے آخر میں لکھتے ہیں:

''انور صاحب! آپ کو ''ماہِ منور'' کی اشاعت مبارک ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں پاکستان آؤں گا، ایک دن کالے کے ہوٹل سے نمکین لسی پینے کے بعد پھول والی گلی سے دونوں ضرور گزریں گے۔'' (۱۱)

لیکن دوستو! اس خوشگوار ترین کتاب کے ساتھ ناگوار ترین حادثہ یہ ہوا کہ یہ کتاب الوقار پبلی کیشنز لاہور سے خوب صورت طباعت کے بعد قزاقستان بھیجی گئی۔ لیکن مصنف کو حسب خواہش واپس آ کر جناب انور مسعود سے ملنا نصیب نہ ہو سکا۔ بلکہ ان کی آخری کتاب ''قزاقستان میں اردو'' کے ساتھ تو اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہوا کہ جب ڈاک کا ہرکارہ کتاب لئے دروازے پر پہنچا تو اندر مصنف کا جنازہ رکھا تھا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کتاب میں جناب انور مسعود کی شخصیت اور فن کا نہایت فنکارانہ تجزیہ موجود ہے۔ مصنف کا اسلوب تنقید سے زیادہ تخلیق کی طرف مائل ہے۔ زیر نظر تصنیف حق دوستی بھی ہے اور جناب انور مسعود جیسے عظیم مزاح نگار اور فنکار کی خدمات کا اعتراف بھی۔

کتاب کے دو پہلوؤں پہ بات کیے بغیر تبصرے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ایک تو کتاب کا نام ہے کہ یہ ترکیب ہمارے کئی نعت گو شعرا نے نبی معظمؐ کے لئے استعمال کی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کتاب میں ''میں'' بہت ہے، یعنی موضوع سے زیادہ مصنف متحرک دکھائی دیتا ہے جیسے کسی زمانے میں نے کہا تھا:

اسلام تو کم ہے ٹی وی میں امجد اسلام زیادہ ہے

(جاری رہنے کا امکان)

**حواشی:** ۱۔ یہ جملہ یوسفی صاحب نے ایک ٹی وی پروگرام کے دوران پڑھا۔ ۲۔ ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن العریفی زندگی زندگی سے لطف اٹھایئے دارالسلام ۲۰۱۰ء ۳۔ ڈاکٹر امان اللہ بھٹی اسلام اور خانقاہی نظام دارالسلام ۲۰۱۰ء ۴۔ مختار مسعود لوحِ ایام العطا، لاہور ۱۹۹۹ء طبع نہم۔ ۵۔ ایضاً ص ۳۷۸۔ ۶۔ ایضاً ص ۳۷۹۔ ۷۔ ایضاً ص ۱۲۹۔ ۸۔ بریگیڈیئر حامد سعید اختر صد شعر غالب فیروز سنز، لاہور ۲۰۰۹ء۔ ۹۔ ڈاکٹر رؤف امیر ماہِ منور الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۰ء۔ ۱۰۔ ڈاکٹر رؤف امیر کی پہلی شادی میٹرک میں ہو گئی تھی۔ اس شادی کو انہوں نے اکثر احباب بالخصوص ادبی حلقے کے دوستوں سے چھپائے رکھا۔ بہت بعد میں انہوں نے اپنی ایک طالبہ عفت سے محبت کی شادی کی، جس سے ان کی تین بیٹیاں فلک، نگارش اور تمکنت ہیں۔ زیر نظر کتاب کا انتساب انہی تینوں بیٹیوں کے نام ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر رؤف امیر کی اچانک وفات کے بعد قبلائی خاں یونیورسٹی کی پاکستان چیئر پر ان کی یہی بیوی عفت رؤف تعینات ہیں۔ ۱۱۔ ڈاکٹر رؤف امیر، ماہِ منور، سخن آغاز (دیباچہ) صفحہ ۱۰

# عنبرین رفیق کا فنی تشخص

محمد افسر ساجد/فیصل آباد

عنبرین اشعر گزشتہ صدی کے آخری عشرے کے درمیان اُبھرنے والی ایک انتہائی ذہین شاعرہ ہیں۔ان کا چوتھا مجموعہ ''ستارے ہاتھ میں ہوتے'' اشاعت کے لیے تیار ہے۔راقم نے اس کے مسودے کا بغور مطالعہ کیا ہے۔اس میں شامل منظومات (حمد و نعت+غزل+نظم) ان کے تخیل کی فراوانی اور زبان و بیان پر گرفت کی آئینہ داری کرتی ہیں اور انہیں اپنے ہم عصروں میں مقامِ امتیاز پر فائز کرتی ہیں۔

جدید دور میں نسائیت کی تحریک (Feminism) کا بڑا چرچا ہے۔دنیا بھر میں خواتین کی معاشرتی اہمیت کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔دنیا کے 'شمالی' اور 'جنوبی' منطقوں کی مسابقت کی دوڑ میں صنف (Gender) کی تخصیص پس پشت چلی گئی ہے۔شعر و ادب میں بھی اس رُجحان کی بازگشت واضح سنائی اور 'دکھائی' دیتی ہے۔اب عورت مغربی یا (شمالی) معاشرے میں بھی نحیف و نزار (Weaker Vessel) شمار نہیں کی جاتی۔اسے اپنے حقوق و فرائض کا مکمل شعور ہے۔یہی رویہ مشرقی (یا جنوبی) طرزِ معاشرت میں بھی در آیا ہے۔

عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، ادا جعفری، بانو قدسیہ، پروین شاکر، کشور ناہید، شبنم شکیل، فہمیدہ ریاض، رخشندہ نوید اور زاہدہ حنا، اردو ادب میں چند ایسے معروف نسائی نام ہیں جنھیں بلا تامل اس روایت (Paradigm) سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ان ادباء میں اپنے ہونے کا شعور اور اس کی شعری تجسیم ایک انتہائی معتبر اور توانا قدرِ مشترک ہے۔اردو فکشن اور شاعری کو انہوں نے اپنی نثری اور شعری تحریروں سے ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے۔

عنبرین اشعر کے یہ اشعار اسی لہجے اور آہنگ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ساحلوں نے پل بھر میں روپ اس طرح بدلا
ہر طرف سمندر تھا بیچ میں کنارے تھے

..................

میں ہوں عنواں کتابِ ہستی کا
ایک اک حرف میں نہاں ہوں میں

..................

وہ بامِ عروج جس پہ عیاں آج ہو تم وہ
ہاتھوں کی لکیروں سے بنائے ہے تو عورت

..................

میں نے ہی گل زمین کو سینچا ہے رات دن
مجھ پر ہی بند ہو گئے کیوں نکہتوں کے در

ادب کو خود کلامی تو کہا جا سکتا ہے، خود نوشت نہیں۔شاعری جذبات کا برجستہ اظہار ہے جس کی اساس صوتی آہنگ ہے۔اس سے اگلا مرحلہ معنی اور مفہوم کی شاعری ہے۔عنبرین اشعر کی شعریات میں ایک ہنگامی جذباتی ہیجان کی بجائے ایک فکری ٹھہراؤ ہے جو اُن کے اسلوبِ بیان کی ایک دل آویز خصوصیت ہے۔

اپنی تاریکیوں میں جی لیں گے
اب نہیں چاہیے پرائی دھوپ

..................

چھوڑ کر جاتے ہوئے سب ایک سے لگنے لگے
سیرتیں سب ایک سی ہیں صورتوں کا فرق ہے

..................

میں بے ثبات ہوں لیکن تری سحر کی بقا
مجھے اندھیروں میں مدغم کبھی نہ ہونے دے

عنبرین اشعر کی شعری تہذیب میں ان کے خاندانی پس منظر کا بھی خاصا کردار ہے۔ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے ہے جس کا شہر کی علمی، ادبی، تدریسی اور ثقافتی زندگی میں ایک نمایاں مگر اہم رول ہے۔اس خانوادے کے مقتدر افراد نے گمنامی میں بھی نام کمایا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جو کسی ستائش یا صلہ کی پروا کیے بغیر اپنے اپنے شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔انکسار، خودداری اور جذب و انہاک ان کا وطیرہ ہے۔اس تہذیبی خمیر کی جھلک عنبرین اشعر کی شعریات میں واضح نظر آتی ہے۔

ہے ضبط مجھے خود پہ مگر کیسے بتاؤں
آنسو جو نہاں تھے وہ تہہ آب نہیں ہیں

..................

پلٹ جائیں گے دستک دینے والے
خدارا در کو نہ زنجیر کرنا
میں نے تو اس خیال سے مانگی نہیں تپش
جلنے لگے تھے روشنی سے جگنوؤں کے گھر

مواد کی معنی خیزی اور تنوع کے علاوہ عنبرین اشعر کی شاعری تکنیکی اعتبار سے بھی خاصی منظم و مربوط ہے۔ان کے ہاں بحور کا انتخاب قافیہ اور ردیف کی بندش اور محاکاتِ شعری کا دروبست، ان کی فنی مہارت کی شہادت دیتا ہے۔مجھے اُمید ہے کہ ان کا یہ شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں قبولِ عام حاصل کرے گا۔

پھر وہی لفظ آئینے بن کر
میری صورت دکھا رہے ہیں مجھے

# رونق حیات کی باوضو غزلیں

نسیم سحر/اسلام آباد

شاعرِ دلنواز جناب رونق حیات نے اپنے نعتیہ مجموعے کا عنوان ''پاؤں چھونے کی طلب'' رکھا ہے جبکہ مَیں نے کتاب پر اپنے مضمون کا عنوان ''رونق حیات کی باوضو غزلیں'' رکھا ہے۔ اپنے مضمون کے عنوان کی تشریح اور جواز بعد میں پیش کروں گا پہلے مجھے ان کی کتاب کے عنوان ''پاؤں چھونے کی طلب'' کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

رونق حیات نے عمر کا زیادہ حصہ، بلکہ ساری عمر ہی مرزا غالبؔ کی طرح بُتکدۂ غزل میں گزاری ہے، جی بھر کے وہاں کی کوچہ گردی بھی کی، میکدۂ چشمِ غزالاں سے منکوں کے حساب سے شراب بھی پی، اور جانے کون کون سے گلستانوں کی خوشہ چینی کی اور اپنا چمنستانِ غزل یوں سجایا کہ ہر شعر میں غزالوں اور گوشت پوست والی زندہ غزلوں کا حسن و جمال، زاویہ ہائے بدن، رنگ و بُو، رعنائی، اور کیف آوری مہکا دی۔ محسنِ اعظم جناب محسنؔ ملیح آبادی نے بجا طور پر انہیں حسن و عشق اور بے تکلف رومان کا منجھا ہؤا شاعر کہا ہے۔ جناب رونق حیات نے غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ شعری میں بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر بات غزل کی ہو رہی ہے اس لئے یہاں ان کے آخری مجموعے ''اشکِ رواں کا موسم'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اور اُس میں بھی جو چیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ ان کی غزل میں لمسیات کا وہ پہلو بھی ہے جس کے رمزیہ بیان کے لئے یہ شعر (جو اُن کا نہیں، مگر بہت پہلے شاید انہی کے لئے کہا گیا تھا) پیش کر رہا ہوں:

کچھ اِس ادا سے اُس نے ناخن مرے تراشے
بجنے لگے بدن کی گلیوں میں ڈھول تاشے

لیکن جب لمس کا یہ جمالیاتی پہلو کوچۂ محبت کی تنگنائے سے آگے، بہت آگے نکل کر عقیدت کی بڑی کائنات، یعنی دیارِ عشقِ رسولِ اکرم ﷺ کا رُخ کرتا ہے تو پھر اس میں ناخن تراشنے اور مرزا غالبؔ کی زبان میں پاؤں داپنے کی نوید سن کر خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول جانے کی کیفیات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، شاعر، اس کا تخیل اور اس کا تخلیقی وفور یکدم ایک ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں لمس کا مطلب فخرِ انسانیت، خاتم النبیین رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دینا، اور فہرستِ غلامانِ محمد ﷺ میں شامل ہو کر اُن ﷺ کے پاؤں چھونے کی طلب میں تبدیل ہو جاتا ہے، شاعر کی لمسیات میں بھی روحانی اور نورانی کیفیات شامل ہو جاتی ہیں، اور وہ عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری میں پکار اُٹھتے ہیں:

بس یہی حدِ ادب ہے آقا ﷺ
پاؤں چھونے کی طلب ہے آقا ﷺ

کچھ یہی کیفیت جناب رونق حیات کے اِس مجموعے کا مطالعہ کر کے مجھے بھی محسوس ہوئی۔ غزل گو شاعر کے جمالیاتی اور تخلیقی جذبے جب عشقِ نبی ﷺ میں ڈھلے تو پھر قدمین شریفین کو چھونے کی طلب نے رونق حیات سے کتاب کا عنوان ہی ''پاؤں چھونے کی طلب'' رکھوایا اور پھر ان کے اس مجموعے میں اس لمسِ روحانی کی تمنا کا اظہار کئی سطحوں پر ہؤا۔

لمسیات کے اِس پہلو پر مزید بات ہو سکتی ہے، لیکن مَیں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ مَیں اپنے مضمون کا عنوان ''رونق حیات کی باوضو غزلیں'' رکھنے کا جواز بھی پیش کروں گا۔ ایک مرتبہ پھر یاد دِلا دوں کہ رونق حیات کی اب تک کی شاعری کا سب سے توانا اظہار ان کی غزل ہی میں ہؤا ہے اور شاید یہ بھی قدرت کی جانب سے ان کی طویل تخلیقی تربیت کا ایک حصہ تھا کہ جب وہ غزل سے نعت کی جانب آئیں تو نعت بھی اس انداز میں کہیں کہ اسے صنفِ غزل ہی کی ایک ہیئت کا درجہ مل جائے، اور غزل کی تمام تر جمالیات و کیفیات نعت کا حصّہ بن جائیں۔ ہاں تو ہؤا یوں کہ رونق حیات کے اسلام آباد میں رونق افروز ہونے سے کوئی ایک ماہ پہلے مُجھے ایک نعت گو شاعر اور ایک نعتیہ جریدے کے مُدیر نے طرحی نعت کہنے کے لئے یہ مصرع دیا:

''غزل جب باوضو ہو جائے، تیری نعت ہوتی ہے''

اِس مصرع پر مَیں نے مطلع میں ہی جو گرہ لگائی، وہ بھی ملاحظہ ہو:

ذہن جب مُشکبُو ہو جائے تیری نعت ہوتی ہے
''غزل جب باوضو ہو جائے، تیری نعت ہوتی ہے''

مگر اس مصرع طرح کی پوری معنویت مُجھ پر اس وقت کھلی جب مجھے رونق حیات کی کتاب کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہؤا کیونکہ ان کی تمام تر نعتیں درحقیقت باوضو غزلیں ہیں، وہی غزل کی

لفظیات، وہی تراکیب، وہی اسلوب، وہی سہلِ ممتنع، وہی محبوب کی شان میں خراجِ عشق و عقیدت، فرق صرف یہ ہے کہ محبوب بدل گیا ہے، اب نہ تو ان کا محبوب وہ ہے جس کی بیوفائی اور بے اعتنائی پر وہ شکوہ کناں رہتے تھے، نہ محبت کی اپنی ہی وہ کیفیت ہے جو اُن سے ''بے وضو'' بلکہ نشۂ عشق میں مدہوش شرابی شرابی غزل کہلواتی تھی۔ چنانچہ جب میرے مطلع کے مطابق اُن کا ذہن مُشکبُو ہوگیا تو صدائے غزل

نوائے نعت میں بدل گئی۔ اور اس کیفیت میں انہیں یہ احساس اور ادراک عطا ہوگیا کہ اب وہ کسی عام محبوب کی شان میں نہیں، بلکہ محبوبِ خدا کی شان میں رطب اللسان ہیں جہاں 'با خدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار'' کا قانونِ عقیدت نافذ ہے، کہ اب وہ غزل کی ہیئت میں مدحتِ رسول ﷺ لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ غزل سے نعت کی جانب سفر میں بجا طور پر انہیں زمین سے آسمان پر جا پہنچنے کا احساس ہوا جسے وہ یوں بیان کرتے ہیں:

جب مجھ کو رہگزارِ مدینہ ملی تو پھر
مَیں راستوں کی دھول تھا، بادِ صبا ہُوا
نعت لکھتے ہیں جو رونق، مستقل
مَیں بھی ہوں اب اُن قلمکاروں کے بیچ
آ گیا نعت لکھنے کا رونق، ہنر
جب شہِ دوسرا ﷺ کا کرم ہو گیا

چنانچہ تغزل اور سہلِ ممتنع سے بھرپور ان نعتوں کو مَیں نے اگر ''باوضو غزلیں'' کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا۔ اب وہ جس عظیم ترین انسان، محسنِ انسانیت کے پاؤں چھونے کی طلب اس کی مدحت کے وسیلے سے کر رہے ہیں، ان کے مقامِ ارفع و اعلیٰ کا انہیں بخوبی احساس ہے، انہیں معلوم ہے کہ اُن ﷺ کے پاؤں تلے زمین و آسمان ہیں، دونوں جہان ہیں، کون و مکان ہیں، چنانچہ یہ پاؤں چھونے کی طلب اُن سے ان نعتوں میں کیا کیا کہلواتی ہے، یہ ان کے کمالِ فن کا مظہر ہے، انہوں نے غزل کو وضو ہی نہیں کروایا بلکہ یوں کہئے کہ آبِ زم زم سے غُسل کروا دیا ہے، اور یہ مت بھولئے کہ ایسا کرنے سے پہلے شاعر کو بھی اپنے بدن ہی کو نہیں، روح کو بھی آبِ کوثر سے غُسل کروانا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا خوب لکھا ہے کہ 'پاؤں چھونے کی طلب' کو پڑھ کر مجھے نعتیہ مضامین کی شعریت اور مضمون آفرینی کی ایک نئی دنیا سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔۔۔ جذبۂ عشق کی شدّت اور تخلیقی موسیقیت نے ان نعتوں کو منفرد بنا دیا ہے''۔ جناب جمیل یوسف فرماتے ہیں کہ ''اس ارمغانِ نعت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اظہار و بیاں میں تغزل کی شیفتگی اور نرماہٹ ہے''۔ خود رونق حیات کہتے ہیں کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے اپنی عقیدت کے انداز کو ایک نئی تغزل آمیز جمالیات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی باوضو غزلوں کے چند شعر دیکھ کر آپ خود اندازہ لگائیے کہ انہوں نے غزل کی صنف کو باوضو کرنے کے بعد کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے:

چلو، کہ ہم بھی وہاں جا کے دیکھ آئیں اب
وہ مے کدہ، وہ مئے عشق، وہ سُبوئے رسول
مجھ کو صحرائے عرب کا پانی
شربتِ جنتِ عنب ہے آقا ﷺ
جس نے زلفِ حیات سلجھائی
ہاں، وہ شانہ مرے حضور ﷺ کا ہے

لیکن غزل کے اسلوب میں کہی جانے والی نعتوں میں بھی انہوں نے رسول ﷺ کی سیرت و کردار، آج کے دَور میں اُن ﷺ کی پیروی کرنے کی ضرورت اور دیگر حوالوں سے بھی بات کی ہے:

اُن کی سیرت سے مل گئے رونق
حل ہمیں زیست کے مسائل کے
اُن ﷺ کے در پر مسیحائی کے واسطے
سب مسیحا بھی بیمار آئے نظر
کاش، آئینۂ سیرت میں شہِ والا ﷺ کے
اپنے کردار و عمل کا کبھی چہرہ دیکھوں

رونق حیات نے بیت اللہ شریف کے بارے میں جو ایک شعر کہا ہے وہ یوں ہے:

جو بُتکدہ تھا کبھی، اُس کی شان تو دیکھو
وہ گھر خدا کا ہے سرکار ﷺ کے حوالے سے

اِس شعر میں اگر بُتکدہ سے مُراد رونق حیات کا دِل لیا جائے تو شاید کچھ غلط نہ ہوگا۔ اب اِس تبدیل شدہ لفظ و معنی کے ساتھ شعر دوبارہ ملاحظہ ہو:

جو اُس کا دل تھا کبھی، اُس کی شان تو دیکھو
وہ گھر خدا کا ہے سرکار ﷺ کے حوالے سے

اس مضمون کا اختتام مَیں جناب رونق حیات کے اِس دُعائیہ شعر سے کروں گا بلکہ اُن کی آواز میں آواز ملا کر کہوں گا کہ:

یہ بھی ممکن ہے بروزِ حشر ہو
میری بخشش نعتیہ اشعار سے

دُعا ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں اپنے پیارے رسول ﷺ کی سفارش کے صدقے میں اِس دُعا کی قبولیت کے لیے میں تمام نعت گو شعراء اور تمام عشاقِ نبی ﷺ کی بخشش کا فرمان بھی جاری ہوجائے۔ آمین ثم آمین۔

# باغِ سخن میں نئی بہار

شاعر علی شاعر/کراچی

علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا۔ ''شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتا ہے اور دوسرا وہ جو اپنے علم اور تجربے سے شاعر بن جاتا ہے۔ اس میں بہتر وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتا ہے۔''

ان جملوں کی روشنی میں اگر عنبرین حسیب عنبرؔ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو باوثوق کہا جاسکتا ہے کہ عنبرؔ ماں کے پیٹ سے شاعرہ ہو کر آئی ہیں۔ کیوں کہ جو شخص اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر شاعری کرتا ہے، اسے آورد سے کام لینا پڑتا ہے اور اس کے فن میں کسی کی مدد شامل نہیں ہوتی۔ جب کہ جو شخص پیدائشی شاعر ہوتا ہے، اس کو آمد کے ذریعے نادر خیالات عطا کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی سخن وروں کی شاعری کو الہامی شاعری کہا جاتا ہے۔ جب آمد والہام کا ذکر ہوتا ہے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس فن میں قدرت شاعر کے ساتھ ہے اور قدم قدم پر اسے خیال کی ندرت، جدید احساس، فکر کی گیرائی و گہرائی، سوچ کے زاویے، تخیل کی بلند پروازی اور خیال و معنی آفرینی عطا کر رہی ہے۔ عنبرؔ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ ملاحظہ کیجیے

بادل کی تصویر بنانے بیٹھی ہوں
میں ساگر کی پیاس بجھانے بیٹھی ہوں
فکرِ سخن کی قوسِ قزح سے میں عنبرؔ
یہ دنیا خوش رنگ بنانے بیٹھی ہوں

جب ہم اُن کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ عنبرؔ کو معلوم ہے، الفاظ کو کس طرح ادا کیا جاتا ہے اور الفاظ کی ادائیگی سے وہی شخص آشنا ہوتا ہے جو اس زبان کے مزاج سے واقف ہو، جس میں وہ شاعری کر رہا ہے۔ عنبرؔ کو اپنے دل کی بات سلیقے سے کہنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ آدابِ گفتگو سے بھی واقف ہیں اور الفاظ کی نزاکت سے آشنا بھی۔ انھیں لفظ کی ذومعنویت سے آگاہی بھی ہے، جس کے برتنے میں عموماً اکثر شعرائے کرام اور خصوصاً شاعرات ٹھوکر کھا بیٹھتی ہیں۔ ملاحظہ ہو

بیتِ زلیخا کی کھوج میں رہے دنیا
اپنی بے گناہی کو دل گواہ کافی ہے

عنبرؔ نے اشعار میں اپنے دل کی بات اور جذبات کی شدت کا اظہار تو کیا ہے لیکن اس محتاط انداز میں کہ ان کی بات کو کوئی کم فہم، ناسمجھ اور بدگمان غلط رنگ نہ دے سکے۔ وہ جذبات کی شدت کی رو میں بہہ نہیں گئی۔ انھوں نے ضبط کا دامن ہمیشہ تھامے رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

زندگی بھر ایک ہی کارِ ہنر کرتے رہے
اک گھروندا ریت کا تھا جس کو گھر کرتے رہے

اس قدر نازک احساسات کو الفاظ کا پیرہن عطا کرنا اور وہ بھی ایسے کہ دیدہ زیب نظر آئے، ناممکن حد تک کارِ مشکل ہے۔ مگر عنبرؔ اس کارِ مشکل سے ممکنہ حد تک کامیاب اور سرخ رو ہو کر گزری ہیں، کیوں کہ وہ اپنے معاشرے کے حسن و قبیح پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے عہد کے مسائل اور تہذیب و روایت سے باخبر ہیں۔ وہ جب کسی محفل میں جاتی ہیں تو اپنے حواسِ خمسہ کو فعل رکھتی ہیں بلکہ کہیں کہیں تو وہ اپنی چھٹی حس سے بھی رہ نمائی حاصل کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو

مانگ رہے ہو رخصت مجھ سے اور خود ہی
ہاتھ میں ہاتھ لیے بیٹھے ہو، تم بھی ناں

جو شائستگی ان کی تر و تازہ شاعری میں نظر آتی ہے، وہ ان کے مہذب ہونے کی دلیل ہے اور جو مودبانہ لہجہ ان کا اسلوبِ اظہار ہے، وہ ان کے مودب ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیوں کہ انھیں اندازہ ہے کہ کس بات کو کب لبوں تک لانا ہے اور کس بات کو زیرِ لب رکھنا ہے۔ ملاحظہ ہو

اب کے تمہارے جذبِ وفا نے مجھ کو جیت لیا
میں نے اپنا آپ جو ہارا، دھڑکن تیز ہوئی

جدید شاعر وہی کہلاتا ہے جو روایت سے منسلک رہ کر جدت سے ہم آہنگ ہو۔ ایسا شاعر نہ اپنے ماضی کو فراموش کرتا ہے اور نہ اپنے حال سے غافل ہوتا ہے بلکہ اس کی نظر ماضی اور اس کے امکانات پر بھی ہوتی ہے۔ ایسا شاعر انسان، انسان کی زندگی اور زندگی کے مسائل کی نشان دہی نہ صرف اشعار کے قالب میں ڈھال کر کرتا ہے بلکہ اس کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جو دیکھتے رہے اوروں کی آنکھ سے دنیا
تو اپنے عہد کی سچائیاں نہ سمجھو گے

☆☆☆

یہ کیا متاعِ زیست گنوانے میں لگ گئے
اہلِ قلم بھی نام کمانے میں لگ گئے

عنبر اپنے دوست نما دشمنوں کو بھی پہچانتی ہے اور ادب کے منافقین سے بھی واقف ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ دوست نما دشمن اور منافق کس طرح پیار سے ملتا ملاتا اپنے محسن کی جڑیں کاٹتا رہتا ہے۔ وہ اس حاسد سے بھی واقف ہیں جو محنت کرنے کی بجائے اپنے حسد کی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو

جن کو یہ زعم ہے کہ زمانہ ہے ان کے ساتھ
وہ جانتے نہیں کہ خدا میرے ساتھ ہے

بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والا ایک پل میں تعلق توڑ بیٹھتا ہے۔ محبت پر جان فدا کرنے کا حلف اُٹھانے والا دولت کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیتا ہے اور یک سر انجان بن جاتا ہے۔ اس نازک صورتِ حال کو عنبر نے شدت سے محسوس کیا تو یوں بیان کیا۔

میں اسے دیکھ رہی ہوں بڑی حیرانی سے
جو مجھے بھول گیا اس قدر آسانی سے

☆☆☆

جس کی آنکھیں میرے آنسو روتی تھیں
آج وہ چہرہ کس درجہ انجان رہا

عنبر ان لوگوں کو بھی تنبیہ کرتی ہے جو تعصب کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں، جو سنی سنائی بات کو آگے بڑھاتے ہیں، جو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عنبر بھی اسی معاشرے کا ایک مفید فرد ہیں۔ وہ اپنے اردگرد سے باخبر ہیں۔ وہ زمانے کے نامساعد حالات کی شاہد ہیں، وہ اس دنیا کی گرتی ہوئی حالت اور زبوں حالی دیکھ رہی ہیں۔ لوگ ہتھیار عام کر رہے ہیں اور اسے ترقی کا نام دے رہے ہیں اور عنبر محبتیں بانٹنا چاہتی ہیں، محبت کا پیغام عام کرنا چاہتی ہیں۔ ملاحظہ ہو

میں نے لکھا ہے محبت کا ترانہ عنبر
جب بھی ایجاد ہوا ہے نیا ہتھیار کوئی

عنبر ایک بیٹی، ایک ماں، ایک بیوی ہونے کے ساتھ بنیادی طور پر ایک عورت بھی ہیں۔ زمانے کے سرد گرم ان پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بدلتے ہوئے موسم انھیں بھی ان کا بچپن اور جوانی یاد دلاتے ہیں تو وہ بے ساختہ کہہ اُٹھتی ہیں۔

دیکھا نہیں کہ گھر کی ٹپکنے لگی ہے چھت
برسا جو ابر جھومنے گانے میں لگ گئے

زندگی کے جس اسٹیج پر عنبر اس وقت ہیں، وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات و جذبات رقم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔ وہ صاف ستھرے، سیدھے سادھے اور سچے انداز میں حقیقتِ حال بیان کر دیتی ہیں، ان کا یہ معصوم رویہ ہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ سچ تلخ ہوتا ہے، اس لیے کڑوا لگتا ہے۔ مکان اور گھر میں فرق بیان کرتے ہوئے انھوں نے یوں سچ سے کام لیا ہے۔

محبت اور قربانی میں ہی تعمیر مضمر ہے
در و دیوار سے بن جائے گھر! ایسا نہیں ہوتا

قوی اُمید اور غالب گمان ہے کہ اگر عنبر اسی طرح تہذیب و شعور اور شائستگی کے دائرے میں رہتے ہوئے اظہار و بیان کے تقاضے اور غزل کے لوازمات، غزل کی روایت سے وابستگی کے ساتھ جدید ترین پیرائے میں پورے کرتی رہیں اور اپنا سچا مافی الضمیر اسی طرح بے باک اور معصومانہ انداز سے بیان کرتی رہیں تو وہ باغ سخن میں نئی بہار ثابت ہوں گی، جس پر کبھی خزاں اثر انداز نہ ہو سکے گی۔ ان کے فن کی کلیاں، فکر کے شگوفے اور خیال کے غنچے، جذبات کی شبنم سے چمکتے نکھرتے اور سنورتے رہیں گے۔ ان کے اشعار کی رنگینی رونقِ گلستاں اور احساس کی خوشبو ایک عالم کو تادیر مہکائے رکھے گی۔

اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ اس عبقری شاعرہ کو نظرِ بد اور حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

## حمد

جب بھی دشمن مری مشکل کو بڑھا دیتا ہے
میرا مالک مجھے دریا سا بنا دیتا ہے

وہ تو انسان کو بے عیب بقا دیتا ہے
اپنا معیار گنہ گار گرا دیتا ہے

نیت شوق کی شدت کبھی واثق ہو تو
وہ زُلیخا کو بھی یوسف سے ملا دیتا ہے

ایسا محسن کہ مرے عیب عیاں کرتا نہیں
اور سجدے مرے ماتھے پہ سجا دیتا ہے

ایسا رحمٰن کہ احساسِ ندامت پر بھی
میری کتنی ہی خطاؤں کو مٹا دیتا ہے

میرا مالک تو وہ رازق ہے کہ جو خلقت کو
سینہ سنگ میں بھرپور غذا دیتا ہے

میرے مالک ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے یہ
ایک سوئی ہوئی مٹی کو جگا دیتا ہے

زاہد محمود زاہد

# میں جانا لاہور

احمد سعید/فیصل آباد

میں سینکڑوں مرتبہ لاہور جا چکا ہوں، پر اب بھی مجھے لاہور پہنچنا ہو تو میں ''ٹھوکر نیاز بیگ'' تک ہی پہنچ پاتا ہوں۔ باقی کا سفر پوچھتے پوچھاتے ہی طے پاتا ہے۔ لاہور بڑے بھائی کی طرف جانا ہو تو میں اُن کی کالونی سے اگلی یا پچھلی کالونی میں بھٹکتا پھرتا ہوں، پھر امی جان اور بیگم ''جان'' کو بار بار کہتا ہوں کہ پچھلی بار تو گھر یہیں کہیں تھا۔ تھک ہار کر بھائی کو فون ملایا جاتا ہے، وہ اچھی طرح سمجھا بجا کر آخر میں تاریخی جملہ کہتے ہیں کہ یار ادھر ہی رکو، میں خود لینے آتا ہوں۔ وہ فقط لینے ہی نہیں آتے بلکہ جب واپس جانے لگتے ہیں تو کسی ایسی روڈ پر چڑھا کے بھی آتے ہیں، جہاں سے کسی حد تک ٹھوکر نیاز بیگ تک ہم رسائی حاصل کر سکیں۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ٹھوکر نیاز بیگ کا علاقہ مجھے بالکل یاد ہے، وہ تو موٹروے سے وہاں اترتے ہیں اور ہم بھی آرام سے اتر جاتے ہیں۔ بس وہاں سے ''نہرو نہر'' ناک کی سیدھ میں جہاں تک سڑک جاتی ہے جا سکتے ہیں، کہیں دائیں یا بائیں مُڑے نہیں تو اب کے
ہم مُڑ گئے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں گے

لاہور تو لاہور کئی مرتبہ فیصل آباد کے کئی علاقوں میں ذرا دیر سے جانے کا اتفاق ہو تو میں اپنے قریبی شاعروں سے پوچھ رہا ہوتا ہوں کہ یہ یہاں کوئی نیا علاقہ بنا ہے؟ وہ مجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ تم کہاں رہتے رہے ہو؟ میں بھی ایک مرتبہ شروع سے ہی شروع ہو گیا انھیں بتانے کہ جلندھر اور ہشیار پور۔ کہنے لگے، ''ایڈا توں ہُشیار رہندا نہیں''۔

بچپن میں اباجی کے ساتھ لاہور جایا کرتے تھے تھوڑا بڑے ہوئے تو دوستوں کے ساتھ جانا شروع کر دیا۔ اب عرصہ دراز سے فقط بیگم کیساتھ جا رہا ہوں ۔ لاہور میں بڑے بھائی، چچا جان، بہت سے دوست اور تو اور بیگم کی بہن تک وہاں موجود ہے۔

لاہور کی بہت سی خوبصورت یادیں ہیں ان میں سے ایک خوبصورت یاد آپ کو بتاتا، لیکن ابھی وہ یاد نہیں آ رہی، آپ کو یاد آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔

۲۰۱۵ میں لاہور سے میری کتاب ''بلاوجہ'' چھپ رہی تھی تو مجھے لاہور بار بار جانے کا اتفاق ہوا، جس سے لاہور کے بہت سے راستے مجھے زبانی یاد ہو گئے (اُن راستوں کے فقط نام ہی زبانی یاد ہوئے ہیں)۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ مجھے ایک دن سخت بھوک لگی، ویسے جتنے دن بھی کتاب کے سلسلے میں لاہور آیا، سخت بھوک ہی لگی۔ لیکن باقی دنوں میں کوئی یار سجن ہتھے چڑھ جاتا تھا، پر اُس دن تو اپنے ہی ''پلے'' سے کھانا پڑا۔ میں نے فیصل آباد ایک دوست کو فون کیا جو اُردو بازار آتا رہتا ہے۔ اُس سے کہا، یار کھانا کہاں سے اچھا ملے گا اُردو بازار میں ۔ کہنے لگا کہ مجھے تو یہاں قریب جنگی بریانی پسند ہے۔ میں تو پہلے بریانی کا نام سُن کر ہی گھبرا گیا، خیر کسی سے پوچھا کہ پیدل جایا جا سکتا ہے؟ وہ بھائی صاحب کہنے لگے کہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کوئی رکشہ وغیرہ لے لیں۔ رکشے والے سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ سو روپے لوں گا ۔ دِل نے کہا، پہلے رکشے والے کو سو، پھر بریانی والے کو دو سو، واپسی پہ رکشے والے کو پھر سو۔ بریانی واقعی جنگی لگ رہی تھی۔ میں نے بھی ہوا میں تیر چلایا کہ یہ ساتھ تو ہے۔ رکشہ والا یہ بات سُن کر ہکا بکا رہ گیا ۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، مجھے لگا کہ '' رکشے میں کچھ کالا ہے''۔ میں نے اردگرد کوئی سُلجھا ہوا شخص ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ایک شخص نے بتایا کہ بالکل ساتھ ہی ہے، پیدل پانچ ساتھ منٹ لگیں گے۔ میں پیدل دس منٹ کے اندر اندر جنگی بریانی پہنچ گیا، اور جنگ و جنگی ہو پڑا بریانی پر۔ لاہور میں اکثر بریانی پائے نہاری کی دکانوں پہ ریٹ لسٹ نہیں لگی ہوتی، پھر کسی دوسرے شہر سے آیا ہوا شخص اُن کھانوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، یعنی کھانوں کا بل جب سامنے آتا ہے تو اُس کے طوطے ہی نہیں سارے پیسے بھی اُڑ جاتے ہیں، پھر اُس شخص کو انور مسعود کا یہ شعر یاد آتا ہو گا کہ

روٹی شوٹی کھا بیٹھے آں سوچی پئے آں ہن کی
کریئے

اب آپ یہ مت سمجھیں کہ میرے ساتھ بھی جنگی بریانی پہ ایسا ہی کچھ ہوا ہو گا۔ یقین کریں کہ انھوں نے تو بریانی کے بعد تھوڑا سا زردہ بھی دیا، زیادہ دیتے تو پوری تحریر ہی اُن پہ لکھ دیتا۔

# پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

ڈاکٹر عطیہ سیّد

فون کی گھنٹی بجی۔ شہر یار نے ریسور اٹھایا: ''ہیلو!''

''ہیلو! شہر یار بھائی! ہمایوں بول رہا ہوں۔''

''اچھا۔ کیا حال ہیں؟''

''کچھ نرم گرم ہی ہیں۔''

''کیوں؟''

''آپ تو بخوبی جانتے ہیں۔''

''ہاں..... بس کرو۔ یار! توبہ کرلو۔'' شہر یار نے چھیڑ چھاڑ کے انداز میں کہا۔

''کس چیز سے؟''

''اس جنون سے کہ سچ کیا ہے۔ دن رات تم سچ کی تلاش میں رہتے ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ مخالفین کا ایک جمِ غفیر تمہارے پیچھے ہے۔''

''بھئی! میرے پیشے کا تقاضا ہے..... سچ کی تلاش۔''

''خیر سچ کیا ہے، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تمہیں تو محض خبر کی تلاش ہونی چاہئے۔''

''شہر یار بھائی! فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تو واقعی سچ کی تعریف مشکل ہے۔ لیکن مجھے محض تلاش ہوتی ہے خبر کے پیچھے چھپی ہوئی کہانی کی۔''

''یوں کرو میرے بھائی! کہ محض خبر دیا کرو۔''

ہمایوں ہنسنے لگا: ''یہ آپ کہہ رہے ہیں! آپ تو مجھ سے دو قدم آگے ہیں اس سلسلے میں۔ تحقیق کرتے ہوئے جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یاد کریں وہ سرکاری دفاتر پر حملے اور آپ نے جو تفتیش کی اس کے نتیجے میں اہم انکشافات، جنہوں نے آپ کے لیے بے شمار خطرات پیدا کر دیئے تھے۔''

جواب میں شہر یار بھی ہنسنے لگا۔

''اچھا شہر یار بھائی! اجازت۔ کل شام ملیں گے۔ اس وقت تو ایک کام سے جا رہا ہوں۔''

''ضرور..... ضرور، لیکن باہر نکلتے ہوئے اپنا خیال رکھنا..... محتاط رہنا۔ کراچی ایک ایسا شہر ہے جو بیک وقت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔''

''مگر میں نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟''

''اُف! یہ تجاہلِ عارفانہ۔ بہت سوں کا بگاڑا ہے..... میرے یار! کراچی کے اندر پھلتی پھولتی ڈرگ مافیا، لینڈ مافیا..... اور نجانے کس کس قسم کے گروہوں اور مافیاز کو بے نقاب کر کے۔''

ہمایوں نے قہقہہ لگایا۔ اور پوچھا: ''اور کیا فردِ جرم مجھ پر عائد کی جائے گی۔''

''تم خارجی ہو..... باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہو۔''

''یہاں تو زیادہ تر لوگ باہر سے آ کر آباد ہوئے ہیں۔''

''درست۔ لیکن جو بھی باہر سے آیا، اس نے یہاں کی فضا کو بدلا اور غالباً مقامیوں کو برا بھی لگا۔''

''تو پھر کیا ہوا۔ وہ جو باہر سے آئے تھے وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ مقامی ہو گئے۔''

''لیکن میرے بھائی! ہوا یہ کہ پھر اور لوگ باہر سے آ گئے۔''

''یہ تو تاریخی عمل ہے۔ لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔''

''اب کی بار یہ عمل آسانی سے ہضم نہیں ہو رہا، کیوں کہ نظامِ انہضام کمزور حالت میں ہے۔''

''بس بھئی بس۔ چیف صاحب! باقی الزامات کل شام خود حاضر ہو کر سنوں گا۔ خدا حافظ!''

اگلی شام ہمایوں وعدے کے مطابق شہر یار کے گھر آیا اور ساتھ میں اس کے بیوی بچوں کے لیے پیزا اور کیک بھی لایا۔

''یار! یہ کیا تکلف ہے۔'' شہر یار نے پیزا اور کیک کے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

''پھا جی! آپ لاہوری ٹھہرے، کھابے ٹھابے کے شوقین، میں بھلا خالی ہاتھ کیسے آتا۔''

''تو جگر! پھر تو مرغ مسلم اور حلیم یا نہاری، سری پائے، لاتے نا۔''

اس پر ہمایوں دل کھول کر ہنسا: ''واقعی غلطی ہو گئی۔''

''ویسے یار! میں تمہیں حقیقت بتاؤں..... میں سبزی خور ہوں۔''

''چھوڑو..... پھا جی! چھوڑو۔''

''نہیں سچ مچ۔''

''تو پھر تم کیسا مسلمان ہے؟''

شہر یار مسکرایا۔ ''بھلا مسلمانی ثابت کرنے کے لیے گوشت کھانا ضروری ہے۔''

''بالکل۔'' ہمایوں کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''تو پھر ڈاڑھی رکھنا بھی ضروری ہو گا۔''

''جو آپ کی ہے اس لیے طالبان سے آپ کے گہرے تعلقات بتائے جاتے ہیں۔''

''گہرے تو نہیں..... جان پہچان ہی کو یار لوگ لے اڑے۔''

''بہر حال اسامہ کا پہلا یا شاید دوسرا انٹرویو آپ

ہی سے منسوب ہے۔''

پھر شہر یار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا: ''پس ثابت ہوا کہ مسلمان ہونے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔''

اتنے میں شہر یار کی بیوی چائے لے آئی۔ دونوں صحافی چائے سے لطف اندوز ہونے لگے جس کے دوران ہمایوں نے مسز شہر یار سے رسمی ہلکی پھلکی باتیں کیں۔

جب بیوی چلی گئی تو شہر یار ہمایوں سے مخاطب ہوا۔

''ہمایوں! تم بہت پڑھتے بھی ہو...... ظاہر ہے سوچتے بھی ہو۔ صحافت ایک قسم کا تحقیقی کام بن چکی ہے۔ ذرا یہ تو سمجھاؤ کہ اچانک ایک صاحب جو کبھی سوویت یونین نہیں گئے...... نہ موجودہ روس میں رہے ہیں، محض ایک مہینے کے ویزا پر ماسکو گئے اور آ کر ایک تنخواہ دار ملازم اور انٹرنیٹ کی مدد سے...... کیوں کہ انہیں انگریزی نہیں آتی، سوویت یونین کے زوال پر اتنی بڑی یعنی موٹی کتاب کیسے لکھ لی اور بقول ان کے روسی سفارت کار انہیں اس کا انگریزی ترجمہ کسی انگریز دان سے کروانے کا کہہ رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے! سر پیر سمجھ نہیں آ رہا ہے۔''

ہمایوں سوچنے لگا۔ ''ہاں یار! تُک تو نہیں بنتی۔''

''یہی میں محسوس کر رہا ہوں...... کئی سوال دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں...... مثلاً سوویت یونین کے عہدِ زوال ہی کو کیوں چنا گیا؟ ان کے عروج اور اس سے پہلے جدوجہد کی سنہری داستان کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟''

ہمایوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ''درست۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ چیچنیا کی آزادی کی اتنی حمایت؟ اگر یہ ان کے مسلمان ہونے کے ناتے تھی تو ہمارے لیے تو کشمیر اور فلسطین کی آزادی زیادہ اہم ہے اور طویل تر بھی۔''

''یقیناً۔ ہمایوں! مجھے تو اس پر بھی حیرت ہے کہ چیچن لڑاکوں کو ''جیالے'' کا خطاب دیا گیا جب کہ بش کے نیو ورلڈ آرڈر کے حوالے اور ان کی اصطلاحوں کے تحت وہ ''دہشت گرد'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیوں کہ 'دہشت گردی' کی اس وقت مستعمل اصطلاح کے مطابق دہشت گرد وہ ہے جو نہتے پرامن شہریوں پر حملہ آور ہو۔''

ہمایوں کی آنکھوں میں غور و فکر دکھائی دینے لگا اور آنکھوں کے نیچے حساسیت کے سیاہ حلقے نمایاں ہونے لگے۔

''شہر یار بھائی! آپ کی بات سو فیصد درست ہے، کیوں کہ خود ''بی بی سی'' پر چلنے والی ایک ڈاکومینٹری میں چیچن سفاکی بلکہ سفاکیوں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ماسکو کے ایک تھیٹر میں چیچن کارروائی کو ہیروازم قرار دینا اور ایک سکول میں کم عمر ننھے منے بچوں کو یرغمال بنانے کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کی فل ٹائم کوریج دنیا بھر میں دیکھی گئی۔ اس کے علاوہ ان میں سے کئی ایک القاعدہ کے بھی رکن ہیں۔''

''چیچن تیل کے ذخائر پر روس کے قبضے کی مخالفت کرنا اور یہ بھلا دینا کہ خود مغرب کی ان پر نظر ہے اور اسی بنا پر چیچن تحریک کو یورپ وغیرہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف یا تو بے خبر ہے یا دانستہ اس امر کی جانب توجہ نہیں دے رہا کہ امریکہ اور یورپ کی نگاہیں دنیا بھر کے وسائل پر عموماً اور ان علاقوں پر خصوصاً جمی ہیں جو پہلے سوویت یونین کا حصہ تھے۔''

''ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے؟'' ہمایوں نے کہا: ''پوٹن (Putin) پر بعض الزامات لگائے گئے جن میں قتل جیسے جرم بھی شامل ہیں...... اور یہ کہنا کہ سوویت یونین کے عہد میں اضافہ ہوا، اس لیے غیر منطقی ہے کہ امریکہ میں بھی ذہنی مریضوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ وہی کہانیاں ہیں جو مغربی میڈیا میں گھما پھرا کے پیش کی جاتی ہیں...... اور کون نہیں جانتا کہ مغربی میڈیا خصوصاً امریکن میڈیا نہ تو آزاد ہے اور نہ غیر جانبدار۔ ان کی آزادیِ اظہار محض شعبدہ بازی ہے۔''

''ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔'' شہر یار بولا: ''لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ لکھاری بغیر شواہد کے بلا واسطہ طور پر پوٹن کی ذات کو نشانہ بنا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ روسی سفارت کار اس کی کتاب کا انگریزی میں ترجمے کی فرمائش کر رہے ہیں اور شاید فنڈنگ بھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پوٹن کی حکومت خود اسی کے خلاف لکھی جانے والی تحریر کے ترجمے کے لیے کہے؟''

ہمایوں نے اپنا بریف کیس اٹھایا: ''چلو لالہ! اس معمے کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ ورنہ سرد جنگ میں تو اس قسم کی باتیں مغربی ذرائع ابلاغ میں عام تھیں، مگر ہم لوگ ذرا کنارا کش ہی تھے۔''

''لیکن اب تو بچے سمجھدار ہیں۔ ہمارے گارڈ آف آنر والے صاحب جنہیں ابتدا ہی میں یہاں ''گورباچوف'' کا خطاب دیا جا چکا ہے...... جانے جاتے جاتے کتنے در کھول گئے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہو...... مگر جس بات پر ہم بات چیت کر رہے ہیں اس کا تعلق لمحہ موجود سے ہے۔'' ہمایوں بولا۔

''میرا دھیان بھی اس سمت جاتا ہے، ورنہ اپنے

وطن میں ان گنت افراد اور صحافیوں کی شہادتوں اور گمشدگی کا موضوع چھوڑ کر اتنے دور کسی یوریشن ملک قصہء پارینہ اور خصوصاً وہاں کے صحافیوں کی موت یا گمشدگی کی کہانیاں اتنے درد بھرے انداز میں لکھنا چہ معنی دارد؟'' شہریار نے ایک اور سوال اٹھایا: ''اور پھر وہی چین اسلام ازم جس کی خامیاں وقت نے واضح کر دی ہیں......اور پھر چیچن! اللہ بہتر جانتا ہے لیکن مشہور ہے کہ ان میں سے اکثر سمگلر اور جرائم پیشہ ہیں۔''

''لالہ! کہیں یہ وہ چنگاریاں تو نہیں جن سے ایک اور آگ بھڑکانے کی کوشش کی جارہی ہو یا ممکن ہے مصنف ذہنی انتشار کا شکار ہو۔''

''بس یار! حیرت میں گم ہوں۔ امید ہے اگلے چند دنوں میں ہم دونوں کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''امید تو ہے۔''

شہریار اور ہمایوں اس بجھارت کو حل کرنے کی آرزو لیے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

دوسرے دن دوپہر کو ہمایوں نے شہریار کو فون کیا، لیکن پہلی بوجھ لینے کی خوشخبری کے بجائے ایک اور سوال پوچھا: ''مصنف نے روس کے پنگوں کا ذکر کیا ہے یعنی کیوبا والا مسئلہ......مگر امریکہ کے پنگوں سے چشم پوشی کرتا ہے جو ہزاروں میل دور ویت نام جیسے غریب ملک سے پچیس برس ایک ناکام جنگ لڑتا ہے اور اپنے بے شمار نوجوانوں کو موت کے سپرد کرتا ہے۔ مصنف کی بے خبری اور غیر معروضی ہونے کی انتہا ہے کہ وہ اس جدلیات ہی سے بے خبر ہے جس سے دنیا کا توازن قائم تھا۔''

''ہاں ہمایوں! مگر میرا سوال اب بھی قائم ہے کہ اس وقت ان عام سی معلومات پر مبنی کتاب کو کس لیے لکھا گیا۔ اسے پذیرائی بھی مل رہی ہے اور ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے......روس میں نہیں، بلکہ انگریزی میں۔ تھنک، مائی ڈیئر واٹسن''

ہمایوں نے بھی آخری جملے کے جواب میں شرارت کے انداز کو اپناتے ہوئے جواب دیا: ''او۔ کے، مسٹر شرلک ہومز۔''

شہریار نے فون کا ریسیور واپس رکھ دیا۔ نجانے کیوں اسے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا......عجیب قسم کا احساس جیسے اس نے کسی کو کھو دیا ہو۔

سورج چمک رہا تھا، مگر شہریار کا کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا تھا۔ وہ لیمپ کی روشنی میں اس وقت ایک رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ لیکن ہمایوں سے باتوں کے بعد اس کا جی اچاٹ سا ہو گیا۔ اس نے لیمپ بجھایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ اتنے میں بجلی چلی گئی۔ گرمی کافی تھی اس پر پل پل کی لوڈشیڈنگ، یو پی ایس خراب ہو چکا تھا اور اب کوئی اسے ٹھیک کرنے والا دستیاب نہ تھا۔ لہٰذا وہ برمودا شارٹس اور بنیان پہن کر ہاتھ سے پنکھا جھل رہا تھا۔

وہ کسی دور دراز نیم مغربی ملک کی حسین صحافی نہیں تھا جس سکارف، خوبصورت بلاؤز اور لانگ سکرٹ میں ملبوس ہو......ملک کی کسی مشہور یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہو......کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ رومان پرور صبحیں اور راتیں گزارتی ہو......جو اک تارہ ہو...... زیب نظر۔ شہریار تو ایک نچلے متوسط طبقے......تیسری دنیا کے ایک غریب ملک کا مزدور پیشہ شخص تھا جس کی شادی روایتی انداز میں ہوئی، اوپر نیچے چار بچے اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے آن پہنچے۔ اب نہ صرف روٹی، کپڑا، مکان بلکہ ان کی تعلیم کا بوجھ بھی اسکے ناتواں کندھوں پر تھا۔ اس کا مکان شہر کے ایسے علاقے میں تھا جس صحافیوں کو تین سے پانچ مرلے سستے داموں دے کر ان پر احسان کیا گیا تھا۔ لیکن سڑکیں اور سیوریج سسٹم خراب تھے۔ سو سڑکیں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں اور سیوریج میں ہولز اُبل کر سڑکوں اور گلیوں کو بے برسات ٹھہرے ہوئے پانی کے جوہڑوں میں تبدیل کر رہے تھے۔ اس کی زندگی میں رومانویت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ شیلے، کیٹس، گوئٹے یا پشکن کی نظمیں نہیں پڑھتا تھا۔ اُسے تو فیض اور بلھے شاہ پڑھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

شام کو شہریار بجلی آجانے کے بعد سو کر اٹھا اور بیوی کو کہا کہ چائے بنا کر لائے۔ بیوی کے چائے بناتے بناتے اس نے بالٹی میں جمع کیے ہوئے پانی سے غسل کیا اور شلوار قمیص، پہن کر ٹی وی لگا دیا۔ اتنے میں بیوی چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے چائے کے مگ سے ایک چسکی لی تھی کہ ''بریکنگ نیوز'' کی ہولناک موسیقی نے جسم میں لرزش سی پیدا کر دی تھی۔

''یا خدا! اب کیا ہوا؟''

ٹی وی چینل نے سسپنس بڑھانے کے تمام حربے استعمال کرنے کے بعد ایک بنی سنوری دوشیزہ نیوز کاسٹر نے لمبی تمہید کے بعد اصل خبر دی:

''ہمایوں حمید......مشہور نیوز رپورٹر کو آج دوپہر ڈھلے اپنے دفتر سے چند گز کے فاصلے پر نامعلوم حملہ آوروں نے چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر دیا۔ مقامی پولیس واقعے کے بعد وہاں پہنچی اور نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔''

''ہمایوں!......'' شہریار کے ہاتھ سے چائے کا مگ پھسل کر زمین پر گرا اور تڑاخ سے بے شمار کرچیوں میں تقسیم ہو گیا۔

ہمایوں......جو چند گھنٹے پہلے اپنے ثابت و سالم وجود کے ساتھ......اپنے گلاب چہرے، ستارہ آنکھوں اور میٹھی باتوں کے ساتھ زندہ تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا، لیکن اس کے ساتھ اسے اپنے اندر سے اٹھنے

والے وسوسوں کے سیاہ بادل بھی یاد آ رہے تھے جن کی بنا پر اس نے محسوس کیا تھا کہ جیسے ہو آخری مرتبہ ہمایوں کی میٹھی آواز سن رہا ہو۔ بہرحال اب ہمایوں کہاں؟ حملہ آور ہمیشہ معلوم ہوتے ہوئے بھی نامعلوم ہوتے ہیں......اور نامعلوم کو کون پکڑ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں کسی طاقتور ملک یا اس کے طاقتور حریف ملک سے بھی تعلق نہیں رکھتا تھا کہ اس کی دردناک کہانی کو دیس بدیس اچھالا جائے جس سے ساری دنیا میں تہلکہ مچ جائے اور مرنے والا یا مرنے والی انتہائی رومانوی انداز میں ہیرو اور شہید صحافت و صداقت بن جائے۔ وہ کوئی زیب نظر ستارہ نہیں تھا محض ایک اندھیری گلی میں جلنے والا گیس کا سٹریٹ لیمپ تھا، کسی نے روڑا مارا اور اڑا دیا کس نے چیخنا اور کس نے پکارنا......کیسا واویلا اور کیسی تشہیر۔ ایک عام آدمی کی موت چاہے وہ کوئی صحافی ہی کیوں نہ ہو، ایک معمولی خبر ہوا کرتی ہے۔ خصوصاً جب وہ دنیا کی کسی عظیم طاقت کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

شہریار کے لیے ہمایوں کی جواں سال موت بجلی کے جھٹکے سے کم نہ تھی۔ چند روز اس کا ذہن بکھرا رہا۔ سوچنے کی قوت شل سی ہوگئی۔ اسے کرب کی کیفیت اور اذیت کے سبب پندرہ دن بعد یاد آیا کہ اس تے صحافت کے میدان کی ایک برگزیدہ ہستی سے ملنے جانا تھا۔ سو اس نے زبردستی اپنے آپ کو کرب کے تعطل سے نکالا اور مشہور سینئر صحافی سے از سر نو ملاقات کا وقت طے کیا۔ بزرگ صحافی نے شہر کے ایک مشہور فائیو سٹار ہوٹل میں ملنے کو کہا اور وہ بھی سوئمنگ پول کے کنارے۔ سو وہ بستر سے اٹھا، شیو بنائی، نہایا اور اپنے اکلوتے تھری پیس سوٹ کو پہن کر اپنی کھٹارا مہران سوزوکی میں بیٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہوا۔

سوئمنگ پول کا پانی شفاف اور فیروزی رنگ کا تھا اور اس کے کنارے آرام کرسیوں پر لیٹے ہوئے ملکی و غیر ملکی کسی اور سیارے کی مخلوق دکھائی دے رہے تھے۔

شہریار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر برگزیدہ جہاں دیدہ صحافی جو شاید کسی بین الاقوامی تھنک ٹینک کا رکن بھی تھا، اپنی مکار آنکھوں میں مسکراہٹ لیے اس کے استقبال کے لیے پول کے کنارے رکھی آرام کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پورے وجود میں امارات رچی بسی تھی، یہ الگ بات کہ جوش جوانی میں اس نے لاہور ریلوے سٹیشن کو بم سے اڑانے کی کوشش کی تھی جو قبل از وقت معلوم ہونے پر وہ اور اس کے ساتھی سب گرفتار ہوئے لیکن موصوف وعدہ معاف گواہ بن کر جیل کی سختیوں اور سزا کی مشقوں سے محفوظ رہے۔

''ہیلو، شہریار، ہاؤ آر یو۔''

'فائن۔ سر!''

''اینڈ ہاؤ گوز دی ورلڈ؟''

''ویل سر! وہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ آپ کو جنتر منتر جو آتے ہیں۔''

گرگ باراں دیدہ برگزیدہ صحافی نے عینک کے شیشوں کے اوپر والے حصے سے بغور شہریار کو دیکھا۔ لیکن طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے مہمان نوازی کے آداب کے مطابق پوچھا: ''کیا لو گے؟ چائے یا کچھ اور؟''

''شکریہ کچھ نہیں لوں گا۔''

''ارے یار کچھ تو لو۔ چائے نہیں تو کوئی مشروب۔''

''چھوڑیں سر! ان تکلفات کو، ویسے بھی لفظ 'مشروب' مشکوک ہے۔'' شہریار نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

''ارے یار! کیوں مذاق اڑاتے ہو ہم بڈھوں کا۔ کبھی ''مشروب'' پہ اعتراض ہے تو کبھی ''جنتر منتر'' کا طنز ہے۔ یار! ہم تو اب عمر رسیدہ ہیں......وہ طاقت......وہ توانائی کہاں۔ ہاں (ball) تو تمہارے کورٹ میں ہے۔''

''بڑے صاحب! آپ بھی تو ہم غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمارے وہ ذرائع......وہ وسائل کہاں؟'' اور قدرے توقف سے شہریار بولا: ''اور وہ ٹچ آف کلاس بھی نہیں۔''

موئی کھال والے بھینسے کی طرح ڈھیٹ بڑی عمر کے صحافی نے طنز کے جواب میں طنز کا وار کیا: ''ہاں......اور ٹچ آف گلاس بھی نہیں۔''

''جی۔ درست۔''

''چلو یار! یہ طنز ونز۔ آمدم برسر مطلب۔ یہ تمہارے ٹولے نے کیا کہانیاں ادھر اُدھر پھیلانے شروع کر دی ہیں۔''

''کونسی کہانیاں؟''

''یہی کہ کسی نے یہاں ''شکریہ گورباچوف'' لکھ کر سوویت یونین کے زوال پذیر اور اخلاقی طور پر کمزور معاشرے کی تصویر کشی کیوں کی اور چیچن تحریک کی حمایت کیوں کی؟''

''میرا خیال ہے کہ صحافتی تجزیے اور تحقیق کو کہانی نہیں کہا جا سکتا۔ باقی سوالات تو اٹھتے رہتے ہیں اور ہر سوچنے والے کا حق بھی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی معلومات درست نہیں جو اس کتاب کے مصنف نے حقائق کے طور پر پیش کی ہیں۔''

''لیکن میرے نزدیک تم لوگ یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہو کہ اس وقت یہ کتاب کیوں لکھی گئی ہے۔ یہ بیکار سوال ہے۔ جب چاہے کوئی شخص کسی موضوع پر کتاب لکھ دے۔''

''جی...... غالباً یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ لیکن اس کتاب کے لکھنے اور شائع ہونے سے پہلے مصنف کا کسی خاص سفارت خانے میں کئی بار جانا...... جبکہ وہ محض بی۔اے پاس ہوا اور ایک لوئر مڈل کلاس کے علاقے میں ایک نجی سکول چلا رہا ہو، تو تھوڑی سی حیرت ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہے اور نہیں بھی۔ کیا معلوم وہ غریب ویزا لگوانے کے چکر میں ہو۔''

''غریب!......کون غریب؟ اس شخص نے تو اپنے سکول کی مزید دو شاخیں کھول لی ہیں اور گزشتہ دنوں پیٹرول کی قیمت کے ساتھ ساتھ سکول کی فیسوں میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ تین دن والدین نے سڑکوں پر احتجاج کیا۔''

جہاں دیدہ صحافی کی آنکھیں مسکرائیں اور پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

''تو بس معمہ حل ہو گیا۔ وہ شاید اس غیر ملک میں اپنے سکول کی برانچ کھلوانا چاہتا ہوگا۔''

''یعنی، ایسے سکول کی......اور پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے اس ملک کے ذریعہ تعلیم یا نظام تعلیم کا علم ہو سکتا ہے۔''؟

''بس یار! تم لوگ زیادہ ہی حساس ہو گئے ہو اور ہر مقام پر تمہیں سازش نظر آتی ہے۔''

''کمال ہے۔ آپ تو جوانی میں خود بھی left کی طرف خطرناک حد تک جھکاؤ رکھتے تھے۔ اب اس مصنف کی کتاب کی جو واضح طور پر مغربی پروپیگنڈے (Propaganda) کی تکرار ہے، آپ نے اپنے اخباری تبصرے میں تعریفوں کے پل باندھ دیئے ہیں۔''

سینئر صحافی نے کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچا۔ ''بات یہ ہے میرے بھائی! رات گئی، بات گئی۔ جوانی گئی...... جوانی کی لن ترانی گئی۔ دیکھو، برخوردار! میرا تمہیں مخلصانہ، دوستانہ، برادرانہ مشورہ ہے......اور وہ یہ کہ اس معاملے پر زیادہ غور کرنا چھوڑ دو۔ غریب آدمی ہو، بیوی بچے ہیں، مشکل سے دو وقت کی روٹی کماتے ہو......اور چلے ہو جیمز ''بونڈ بننے۔''

شہریار کے چہرے پر ناگواری کے آثار دکھائی دیئے۔ ''آپ تو شاید ہمایوں کی موت کو بھی بھلانے کا مشورہ دیں گے...... بلکہ شاید نہیں، یقیناً...... کیوں کہ آپ کے خیالات عالیہ کے مطابق تو بہترین فلسفہ حیات Rnagmatism ہے۔ جس کا آسان ترجمہ منفعت پسندی اور موقعہ پرستی ہونا چاہیئے۔ اس کا اظہار آپ بارہا اپنے ٹی وی کے پروگراموں میں کر چکے ہیں۔''

اب کے گرگ باراں دیدہ کے دیدوں میں رنجش کی خطرناک جھلک دکھائی دی: ''ہاں۔ یہ میری زندگی کے تجربے سے سیکھا ہوا سبق ہے۔ سیاست اور اخلاقیات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں...... نہ ہو سکتا ہے۔ تم نئی نسل کے صحافی سرابوں کے جنگل میں بھٹک رہے ہو۔ میرا اب بھی تمہیں یہ مشورہ ہے "Don't chase the wild goose."

ان جملوں کے ساتھ ہی جہاں دیدہ و کامیاب صحافی نے کرسی سے اٹھ کر الوداعی انداز میں شہریار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گویا کہ اشارہ تھا کہ انٹرویو ختم ہوا۔

جونہی شہریار واپس جانے کے لیے مڑا تو عقب سے آواز آئی: ''ویسے یہ تو بتاتے جاؤ کہ ہمایوں کس ٹوہ میں تھا اور کیا وہ کسی حد تک اس گمشدہ سرے کے قریب تھا؟''

شہریار کا جی چاہا کہ پلٹ کر پلے ہوئے ''تھینک ٹینک'' کے منہ پر ایک چپت رسید کرے حالانکہ عام طور پر وہ ایک دھیمے مزاج کا شخص سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس نے اپنے جذبات پہ قابو پاتے ہوئے کہا ''یہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔''

کئی روز...... ہفتے...... مہینے گزر گئے، لیکن صحافی برادری کے دباؤ اور مظاہروں کے باوجود ہمایوں کے قاتل گرفتار نہ ہو سکے۔ اگرچہ شہریار کے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح شدید چبھن پیدا کر رہی تھی لیکن شاید اسی چبھن اور کسک کی بنا پر وہ دن رات ''گورباچوف! شکریہ'' کے معمے کو سلجھانے میں جتا رہا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی اور ہمایوں کی اکٹھی کی ہوئی معلومات کو بار بار پڑھا اور ان پر غور و فکر جاری رہا۔ یہ وہ حقائق و مشاہدات تھے جو مذکورہ کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے اور مذکورہ کتاب کے مصنف کے ایک خاص ملک کے سفارت خانے میں آمد و رفت سے پہلے کی تمام بین الاقوامی اور قومی اخباروں میں لکھے جانے والے کالموں، مضامین اور خبروں پر مشتمل تھے۔ جو پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ در تہہ...... دائرہ در دائرہ ایک دوسرے سے مربوط، لیکن بظاہر غیر مربوط تھیں۔ یوں یہ بھول بھلیوں سے کم سے کم نہ تھیں جو تاریک یا کم از کم نیم تاریک تھیں۔ مگر اس کا دل کہتا تھا کہ انہی میں کوئی روشنی کا نقطہ بھی ہے اور وہ متلاشی تھا اس روشنی کے نقطے کا جو اگر مل جائے تو اندھیرے میں راستہ مل جائے گا۔

وہ بار بار انٹرنیٹ پر ساری دنیا اور خصوصاً اپنے ملک کی اہم شخصیات کے بیانات، ملکی اور غیر ملکی مدبرین کے مضامین اور اپنے ہاں پل پل بدلتی صورتحال کے بیچ کسی ربط کی تلاش میں رہتا......اور آخر ایک دن اسے ایک غیر ملکی اخبار میں جس کے قارئین شاید زیادہ نہ تھے) تیسرے صفحے پر دو سطروں کی ایک خبر فلمی اور نیم سیاسی خبروں میں دبی دکھائی دی۔

"......امریکہ سے تعلقات میں تناؤ کے بعد نئے امکانات کا جائزے لے رہے ہیں۔" 2011ء Bcacon, London, Sat, ...... May-2011

شاید اس خبر کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو......شاید یہ من گھڑت کہانی ہو......لیکن شہریار کی چھٹی حس نے اس سے سرگوشی کی: "اس خبر کے نیچے پنسل سے سرخ لکیر کھینچو۔"

وہ اس ساری مشق سے تھک ہار کر سو گیا، مگر نیند میں بھی ذہن کسی گوشے میں دو سطری خبر گردش کرتی رہی......اور پھر اسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھ اضطراری طور پر کھل گئی......بالآخر وہ روشنی کا نقطہ جگنو کی طرح اندھیرے میں جگمگانے اور اس کے گرد منڈلانے لگا......وہ روشنی کا نقطہ جس کے لیے وہ بھٹک رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور انٹرنیٹ پر دو سطری خبر کے سیاق سباق ڈھونڈھنے لگا۔ اس کو میڈیا نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی یا کسی اور سبب سے نہ تو نمایاں ہوئی، نہ اس کے تجزیے اور اس کے بارے میں بحث مباحثے کی نوبت آئی لیکن شہریار کے لیے یہ دبی ہوئی یا دبائی ہوئی خبر اس لیے قابل غور تھی کہ اس خبر کے چند ہفتوں بعد ملک کی بیک چینل یا بیک ڈور ڈپلومیسی کے ایک ماہر کا ایک خاص ملک کے دارالحکومت میں آنا جانا شروع ہو گیا جو تین وجوہات کی بنا پر اہم تھا:

(ا) مذکورہ ملک دنیا کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت تھی جسے رفت گزشت سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ دوبارہ زور پکڑ رہی تھی۔

(ب) بیک ڈور ڈپلومیٹ کی آمد و رفت کو خفیہ رکھا گیا اور شہریار کو کافی تگ و دو اور کھوج کے بعد اس کے بارے میں معلوم ہوا۔

(ج) دو ماہ بعد ایک اور عہدیدار......اور پھر سب سے بڑے عہدیدار کا وہاں جانا......چہ معنی دارد۔

آہستہ آہستہ بکھری ہوئی کڑیاں جڑنے لگی تھیں بلکہ ہلکا سا خاکہ بھی غبار راہ سے ابھر رہا تھا۔

"تو یہ ہے بات۔"

شہریار کی آنکھیں مکمل طور پر کھل چکی تھیں اور اس کے ذہن میں کئی سو واٹ کا بلب جلنے لگا تھا۔ اس نے معاملات کے مختلف پہلوؤں اور تفصیلات کا مزید سراغ لگایا اور اپنی تحقیقی رپورٹ لکھنی شروع کی۔

آخر اس نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر سے ملاقات کی درخواست کی اس خوشخبری کے ساتھ کہ وہ انکشافات کرنے والا ہے جس سے اخبار کی اشاعت میں مزید چونکا دینے والا اضافہ ہوگا۔ ایڈیٹر نے اُسے ملاقات کے لیے بارہ بجے رات کا وقت دیا۔

وہ رات بارہ بجے سے پہلے اپنی کھٹارا مہران سوزوکی پر گھر سے نکلا......اور پھر زندہ گھر نہیں لوٹا۔ اس کی پراسرار گمشدگی کی رپورٹ درج ہونے کے کئی روز بعد اس کی کار شہر سے باہر ہائی وے سے کئی گز پرے کچے میں خالی ملی اور لاش اس سے بھی پرے ایک برساتی پل کے نیچے۔ بظاہر اس پر تشدد کے کوئی آثار نہیں تھے مگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق الٹے ہاتھ کی دو پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جو غالباً زوردار ٹھڈوں کے باعث ٹوٹیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں ٹھڈوں کی شدت سے دل کا دورہ پڑا جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔

اخبارات اور ٹی وی چینلز نے اس بہیمانہ قتل کی خبر کو اچھالا اور اس کے محرکات کو کھنگالا، پڑھے لکھے حلقوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ سیاست دانوں نے اس واقعے کی "مذمت" کی، مبصروں نے طریقہ واردات، واقعے کے پس منظر اور وجوہات پر تفصیلی گفتگو کی۔ ایک قیاس یہ پیش کیا گیا کہ یہ ملکی حساس اداروں کا کام تھا۔ دوسرے قیاس کی رو سے غیر ملکی ایجنٹوں کا، جو کافی تعداد میں ملک میں سرگرم عمل تھے ایک نظریہ یہ تھا کہ ہمسایہ ملک کی انڈر ورلڈ ملوث تھی اور تیسرا نظریہ یہ تھا کہ عالمگیر دہشت گرد تنظیموں کا اس قتل میں ہاتھ تھا۔

دنوں تک شہریار کی گاڑی لاش کے کلپس (Clips) اور قتل کی خبر ٹی وی کے ناظرین کو تڑپانے کے بعد اچانک پردہ سیمیں سے غائب ہو گئی۔ روداد عشق طاقِ نسیاں میں دھری رہی......جو رہی سو بے خبری رہی......نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔

ایک دن جب ایک وزیر سے شہریار کے رفیق کار نے اس کے قتل کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: "چلو جی! مٹی پاؤ۔"

اور شہریار واقعی منوں مٹی تلے دب گیا جس کا نوحہ پڑھنے کوئی نہ چلا......نہ کوئی لکھاری، نہ کوئی نظم گو۔

ایک بات جس کا شاید کسی کو علم نہیں کہ دمِ آخر جب اسے وہ جان لیوا ٹھڈا لگا جس سے اس کی حرکت قلب بند ہوئی تو اسے کسی شاعر کی کوئی نظم یاد نہیں آئی۔ اس پل نہ سورج تھا......نہ چاند......نہ تارے......بس درد کی شدت تھی......اذیت کی انتہا تھی......اور پھر اندھیرا......گہرا اندھیرا......جس نے اس کے وجود کو سیاہ چادر میں لپیٹ دیا۔

# آل اِن وَن

حنیف سیّد/انڈیا

''غلطی کوئی بھی کرتا ہے، انسان معاف کر دیتا ہے، معاف تو بھگوان بھی کر دیتا ہے، لیکن غلطی کبھی معاف نہیں کرتی، بڑے بابو...!'' راکیش نے آفس سے باہر نکلتے ہوئے بڑے بابو کو سمجھایا۔

''پر میں کیا غلطی کر رہا ہوں...؟'' بڑے بابو نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''شادی نہ کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہو بڑے بابو'' راکیش کہہ کر اپنے راستے مُڑ گیا اور بڑے بابو سوچتے ہوئے اپنے گھر آ گئے۔

بڑے بابو، پہاڑ پر جمی برف کی طرح ٹھنڈے تھے، بالکل بج اور میٹھے بھی۔ کبھی کبھی لوگوں کے طنز سورج کی گرم شعاعوں کی طرح چبھتے بھی اُن کے اور وہ حالات کے تحت تھوڑا بہت پگھل بھی جاتے، مگر رہتے میٹھے کے میٹھے ہی۔ اونچائی سے گرتے، پتھروں سے ٹکراتے، دھول سے گزرتے۔ پر، رہتے پھر بھی میٹھے اور ٹھنڈے بھی۔ لوگوں کی باتیں گرم ہواؤں کی طرح اُن کے وجود سے ٹکرا کر گزر جاتیں، اُن کو لگتا بھی کہ کوئی دل و دماغ کو جھنجوڑ گیا، اندر ہی اندر۔ لیکن وہ پھر بھی جمے رہتے، اپنی جگہ۔ اُن کے دِل و دماغ میں کچھ کدورت آ بھی جاتی۔ پر، پل دو پل کے لیے۔

ماں باپ کے اکلوتے تھے بڑے بابو۔ پہاڑوں کی آگ سینے میں دبائے چپ چاپ زندگی گزار رہے تھے وہ۔ اُن کے گھر میں ایک کتا، ایک توتا، اور دو چار مرغیاں مرغے تھے۔

صبح ہوئی، فراغت کے بعد کھانا بنایا، خود کھایا، جانوروں کو کھلایا، تالا لگایا اور نکل گئے، آفس کے لیے۔ آفس سے چھوٹے، ہوٹل سے کھانا لیا، گھر آئے، کھایا کھلایا، اور سو رہے۔ بس ...! یہی معمول تھا، اُن کی زندگی کا۔ اتوار کی تعطیل میں دو کام اہم تھے اُن کے۔ بازار سے سامان لانا اور مکان کی صفائی۔ دیگر تعطیلات میں دوستوں کے یہاں بھی چلے جاتے، مگر کبھی کبھار۔ پر، اپنے یہاں آنے کا موقع کم ہی دیتے تھے دوسروں کو۔

ایک دیوالی، اُن کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا میرا۔ اُن کے دیے وقت کے مطابق پہنچ کر جب گھنٹی بجائی، تو اُن کا حلیہ دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آئی۔ اُن کے ایک ہاتھ میں کف گیر، اور دوسرا ہاتھ بیسن میں لتھڑا ہوا، ماتھے پر پسینے کی بوندوں کے ساتھ، جہاں تہاں ہلدی کے داغ، تہہ بند اور بنیائن پر بھی بیسن نے دستخط کر رکھے تھے اچھی طرح، جہاں تہاں۔

''بڑے بابو...! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے آپ نے...؟'' میں نے ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

''اما کیا بتاؤں یار...! پکوڑے بنا رہا تھا، مرغا پاس کھڑا تھا، بلّی آ دھمکی کہیں سے اور مرغا ہلدی مرچیں اُڑاتا ہوا نکل گیا، آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں، بہت دھویا، دیکھو...! اب بھی سُرخ ہیں نا...؟'' بڑے بابو نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں پھیلا دیں۔

''ہاں ہیں۔'' میں کہتا ہوا اندر چلا گیا، اُن کے ساتھ۔ کھانا بنوایا، کھایا پیا اور چلا آیا۔

-----------------

''یہ مرغ مسلم بنایا کیسے جاتا ہے، راکیش بابو...؟'' ایک روز آفس میں بڑے بابو نے راکیش کو فائل دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''ایک ساتھ دو غلطیاں کر رہے ہو، بڑے بابو...!'' راکیش نے اُن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''غلطیاں...! کون سی غلطیاں...؟'' بڑے بابو چونکے۔

''ایک تو فرید کی فائل مجھ کو دے رہے ہو، اور دوسرے مرغ مسلم بنانے کا طریقہ کسی خانساماں کے بجائے، مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' راکیش نے جواب دیا اور بڑے بابو شرمندہ ہو کر فرید کی جانب مڑ گئے۔

''بڑے بابو ...! میری مانو تو ایک کام کرو...!'' فرید نے فائل لیتے ہوئے بڑے بابو سے کہا۔

''وہ کیا...؟'' بڑے بابو نے پوچھا۔

''شادی کر لو...!'' فرید نے مشورہ دیا۔

''اجی کیا ضرورت ہے شادی کی...؟'' بڑے بابو بے ساختہ بھڑک گئے۔

''ضرورت تو ہے۔ بیوی ہوتی تو مرغ مسلم کے بارے میں نہ پوچھتے۔''

''وہ تو گوگل پر سرچ کر لوں گا۔''

''گوگل پر سرچ کر لینے سے مرغ مسلم نہیں بن جاتا، بنانا پڑتا ہے۔''

''سنا ہے کھانا بنانے کی مشین آ گئی ہے مارکٹ میں۔ اُس میں جس وقت کا جو بھی کھانا فیڈ کر دو گے۔ وقت پر تیار ملے گا، گرما گرم۔'' بڑے بابو، بڑے اطمینان سے فائل دے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

''کھانا بنانے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں گھر میں، بڑے بابو...!'' فرید نے سمجھایا۔

''ہاں ہیں، لیکن اب سارے کام مشینوں سے

ہو جاتے ہیں،فرید...!'' بڑے بابو ٹال گئے۔

''کیا کیا کام کرواؤ گے مشینوں سے ..؟'' فرید نے انگلیاں نچاتے ہوئے اُن کا پیچھا کیا۔

''پہلا کام وقت پر سو کر اُٹھنا، جس وقت کا بھی الارم لگا دو، اُسی وقت ٹن ٹنن ،ایک منٹ اِدھر، اور نہ اُدھر۔ اسی طرح اور بھی مشینیں ہیں۔ جیسے پانی گرم کرنے کی مشین، مسالا پیسنے کی مشین، کپڑے دھونے کی مشین، لگتا ہے ٹی، وی، پر اسکائی شاپ نہیں دیکھتے آپ...؟'' بڑے بابو نے جیسے بازی مارلی۔

''دیکھتا ہوں جناب...!لیکن یہ تو بتاؤ....! کیا بچے بنانے کی بھی مشین بنائی ہے اسکائی شاپ نے....؟'' فرید نے نیا پتا پھینکا۔

''نہیں بنائی ہے، تو بنالی جائے گی، ایک نہ ایک دن۔ ایک سے ایک سائنس داں پڑے ہیں دنیا میں۔'' بڑے بابو نے نہلے پر دہلا مارا۔

''تو انتظار کرو بڑے بابو....!''

''وہ تو کروں گا ہی...!'' بڑے بابو نے فائنل کر دیا۔

---

''اوبے فرید...!'' ایک روز بڑے بابو نے دفتر میں آتے ہی بہ آوازِ بلند فرید کو مخاطب کیا۔

''کیسے...؟''

''اب ایجاد ہو گئی، وہ مشین۔''

''مشین..! کون سی مشین....؟''

''وہی نا...! بچے بنانے والی، اب ٹیسٹ ٹیوب میں تیار ہونے لگے ہیں بچے۔ پڑھا نہیں اخبار میں...؟''

''پڑھا تو ہے۔ پر یہ تو بتاؤ....! لا کب رہے ہو وہ مشین...؟'' فرید نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ابے فرید...! تو جانتا نہیں یار..! آج کے دور میں اتنی مشینیں خریدنا، ہے کب میرے بس کا...؟ میں تو ایک کلرک ٹھہرا، وہ بھی بوڑھا، پچپن کا۔''

''پھر کروگے کیا...؟''

''سوچتا ہوں، جب ساری مشینیں ایک ساتھ ایک ہی مشین میں آجائیں گی، یعنی کہ آل، اِن، ون، تب ہی خرید سکوں گا میں تو۔''

''نہ مریں گے دادا، اور نہ بٹیں گے بیل۔''

'بٹیں گے بیل ، ضرور بٹیں گے ۔ دیکھ لینا تم...! دادا کو تو مرنا ہی پڑے گا، ایک نہ ایک دن، سمجھے...؟'' بڑے بابو کی آنکھوں میں امید کی چمک کوندگئی۔

''لگتا ہے دادا سے پہلے تم ہی چلے جاؤ گے آل اِن ون کے چکّر میں۔''

''لگتا تو یہی ہے فرید....!'' بڑے بابو افسردہ ہوگئے۔

---

''مرگئے، دادا۔'' ایک روز بڑے بابو دفتر آکر اُچھل پڑے۔ لوگ سمجھے کہ واقعی چلے گئے اُن کے دادا۔

''دادا مرگئے...؟'' راکیش نے پوچھا۔

''ہاں...! مرگئے، دادا، اب بٹیں گے، بیل۔ یعنی کہ آل، اِن، ون، آگئی مارکٹ میں۔'' بڑے بابو خوشی میں جھوم کر بولے۔

''تو لے آؤ نا....!''

''جا تو رہا ہوں اتوار کو دِلّی۔ تم سب بھی چلو نا میرے ساتھ ...!'' بڑے بابو نے التجا کی۔

سوموار کو بڑے بابو آفس آئے، تو حلیہ ہی بدلا ہوا تھا اُن کا۔ بال کالے، کریم کلر کا سوٹ، کالا بوٹ، بوٹ کی ہل ہائی، سوٹ پر سرخ ٹائی، چھوٹی مہری کی پینٹ، اُس پر سیکسوینٹ، نیا رومال، مستانی چال۔ آتے ہی نمستے مارا، کسی کی سمجھ میں نہ آیا ماجرا سارا۔

''کیا آل ،اِن، ون، لے آئے بڑے بابو...!'' میں نے پہیلی بوجھتے ہوئے دریافت کیا۔

''رات ہی تو لایا ہوں، تم دیکھ نہیں رہے ہو مجھ کو۔''

''وہ کیا...؟''

''یہ پریس لگا خوش بودار ننھنا تا سوٹ، کالا چمچماتا بوٹ، لال رومال، کالے بال، ٹناٹن حال، مستانی چال، اُسی مشین کی تو دین ہے نا..!'' بڑے بابو آنکھیں مٹکا کر پورے گھوم گئے۔

''ہاں...؟'' راکیش نے آنکھیں پھیلا دیں۔

''ہاں..! فٹافٹ کرتی ہے کام، میری آل، اِن، ون۔''

''تو دکھاؤ گے کب اپنی آل اِن، ون...؟'' راکیش نے پوچھا۔

''آج ہی آجاؤ شام کو...!'' بڑے بابو نے کہا، ہم سب نے حامی بھرلی اور بڑے بابو ہاف ٹائم کی چھٹی لے کر سرک گئے، آفس سے۔ ہم لوگوں نے بھی اُن کے دیے وقت کے مطابق پہنچ کر اُن کے مکان کی گھنٹی بجادی، اور بڑے بابو نے ہم سب کو اندر بلا لیا۔

''کہاں ہے آپ کی آل، اِن، ون....؟'' میں نے بڑے بابو سے دریافت کیا۔

''وہ دیکھو...! آپ لوگوں کے لیے کھانا تیار کررہی ہے، میری آل، اِن ، ون ،یعنی کہ لال اِن وَن۔'' بڑے بابو نے خوشی میں جھوم کر بڑے رُعب سے اُس جانب اشارہ کیا، جہاں سرخ کپڑوں میں، پسینے سے لت پت، کمر میں دوپٹا لپیٹے، ایک نازنین کھانا بنانے میں جی جان سے لگی تھی۔

# ڈائری II-I

انیلہ بھلر/امریکہ

کسی بھی ملنے والے صدمہ، دکھ کی شدت میں اس وقت اضافہ ہو جاتا ہے جب اس صدمہ یا دکھ یا درد کا باعث وہ شخص ہو جس سے سب سے زیادہ امید ہوتی ہے، جس پر سب سے زیادہ یقین ہوتا ہے یا جس سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں آنکھیں تو خالی ہوتی ہیں لیکن روح آنسوؤں میں تر ہو جاتی ہے۔ عجب سا درد ہوتا ہے کہ تکلیف کبھی تو دِل میں محسوس ہوتی ہے تو کبھی جگر سے اٹھتی ہے۔ کبھی روح کسی تیز دھاری تلوار سے چیری جاتی ہے۔ مجھے کبھی درد نہیں ہوا تھا۔ کبھی کوئی دِلی صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ لیکن پھر ایک دن آیا کہ میں بھی کسی زخم کی طرح رسنے لگی تھی، کسی چوٹ کی مانند دُکھنے لگی تھی۔ کیونکہ تکلیف وہ صدمہ وہ اذیت مجھے تم سے ملی تھی۔

..........

یاد ہے ہم کتنا ہنستے تھے، اُس روز بھی تم مجھے ہنسائے جا رہے تھے اور میں ہنستی جا رہی تھی۔ شاید تمہارا فون نہ آ جاتا تو تم مجھے ہنسا ہنسا کر ہی مار دیتے اور اب سوچ رہی ہوں کہ اس روز تم مجھے ہنسا ہنسا کر مار ہی دیتے تو اچھا تھا کہ اب جو یادوں کی تیز، زہریلی برچھیاں میری روح کے آر پار اترتی ہیں۔ بڑا درد دیتی ہیں یادیں۔

..........

''میں چار رشتے توڑ کر ایک رشتہ نہیں بچانا چاہتا۔'' تم بول رہے تھے اجنبی آواز میں تم محبت میں سودا کر رہے ہو، محبت کاروبار کا نام نہیں۔

''تم سے محبت کی ہے میں نے، پورے دل سے کی ہے۔ اب بھی کرتا ہوں۔ لیکن تم سے محبت کر کے مجھے ملا ہی کیا ہے، تم نے مجھے دیا ہی کیا ہے۔''

''اگر لینے دینے ہی سے محبت قائم رہتی ہے تو ملا تو مجھے بھی تم سے کچھ بھی نہیں ہے۔''

تم سے پہلے اس گھر میں ایک رونق تھی، ایک زندگی تھی، تمہارے آتے ہی سب کچھ بدل گیا ہے، کوئی اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھتا۔'' تم کتنا اونچا اونچا بول رہے تھے۔

''اس گھر میں پہلے بھی کون آتا تھا۔''

''تم نے مجھ سے میری ماں، میرا باپ اور میرا بھائی سب دور کر دیے۔''

''میں نے تم سے تمہاری بیٹی دور نہیں کی، تم اپنی پہلی بیوی سے آج بھی ملنے جاتے ہو۔ تمہیں اگر یہ لگ رہا ہے کہ میری وجہ سے تمہاری ماں، باپ، بہن بھائی تم سے دور ہو گئے ہیں تو وہ تو تم سے کبھی قریب تھے ہی نہیں۔ انہوں نے جس طرح تمہیں پالا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو اور آج تمہیں میں اور میری محبت پھیکی لگ رہے ہیں؟''

تمہیں میری محبت پھیکی لگ رہی تھی کیونکہ اس میں سے ساری مٹھاس تمہارے رویے نے چوس لی تھی۔ کبھی کبھی ایسا کیوں ہو جاتا ہے کہ محبت بھی سانس لینے کے لیے ایسی ہی فضا چاہتی ہے جس میں محبت کی آکسیجن ملتی ہو؟ یا محبت کبھی ایسا پودا بن جاتی ہے جو پانی نہ ملنے پر سوکھ بھی جاتا ہے۔ کیا میں اور میری محبت اب سوکھنے لگے تھے؟

..........

وہ شام کس قدر سہانی تھی جس روز ہم پہلی بار ملے تھے۔ ملنے پر ہرگز یہ نہیں محسوس ہوا تھا کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ ہم کتنی جلدی گھل مل گئے تھے۔ ہمیں ایک سی بات پر غصہ آتا تھا اور ایک سی بات پر ہنسی آتی تھی۔ اگلی ملاقات پر تم سرخ رنگ کا گلاب لائے تھے اور تیسری ملاقات پر انگوٹھی۔ دن بڑے ہی حسین تھے۔ اور اب......

..........

''تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے شادی کیوں کر رہا ہوں۔''

''ہاں اس لیے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔''

''ہاں یہ بھی ایک وجہ ہے لیکن ایک وجہ اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ تم سے میرے گھر والے بھی محبت کرتے ہیں۔''

تم نے یہ کہا تو میں کتنا اِترائی تھی۔

لیکن اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ شاید اس طرح تو محبت Conditional ہو گئی تھی کہ جب گھر والوں کو بھی مجھ سے پیار ہو تو شادی کر لی جائے اور جب ان کا پیار محبت سے نفرت میں ڈھل جائے تو......

محبت میں کوئی Condition نہیں ہوتی اور نہ ہی ہونی چاہیے۔ اس کا لطف جاتا رہتا ہے۔ جیسے اب تمہاری محبت کا جانے لگا کہ اب میں تمہارے گھر والوں کی نظر میں کھٹکنے لگی اور شاید تمہاری بھی۔

''تمہاری بیوی تمہاری سابقہ بیوی کب بنے گی؟'' میں نے اس روز پوچھا تھا تو تم کیسے انجان بننے کی اداکاری کرنے لگے تھے۔

''کیا مطلب تمہارا؟''

مطلب صاف ہے، تم نے کہا تھا کہ ایک سال بعد طلاق ہو جائے گی لیکن......

''میں نے تم سے کب کہا تھا کہ ایک سال بعد اسے طلاق دوں گا۔''

''تمہیں یاد نہیں لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے یہ بات مجھ سے کس دن، کس تاریخ کس وقت اور کس موقع پر کہی تھی۔''

''ہو جائے گی طلاق بھی، ویسے میرا اس سے پچھلے سات سال سے کوئی تعلق نہیں میں اس کی طرف جاتا ہوں تو صرف اپنی بیٹی سے ملنے۔''

میں تمہاری باتوں پر کیسے یقین کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی لیکن پھر اس روز کتنی دُور سے اُس خبر نے مجھے دھکا دے دیا تھا۔

''تمہاری بیوی کے ہاں بچہ ہوا ہے۔''

میں بے جان سی لاش تمہارے سامنے کھڑی تم سے سوال پوچھ رہی تھی اور تم لاجواب تھے۔

''کس کا بچہ ہے وہ؟''

تم کچھ نہیں بولتے تھے۔ تمہارے پاس شاید کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ تم چپ رہے اور اس دن کے بعد پھر میں وہ سیڑھیاں جو اعتماد کے رشتہ کی بنی تھیں اب اترنے لگی۔

.................

ہاں میں دُکھی تھی، بہت دُکھی، ٹوٹی تھی بہت ٹوٹی تھی لیکن تم سے محبت میں ابھی کسک باقی تھی جو تم سے جدائی سے روک رہی تھی کہ مجھے لگتا تھا کہ میں ایک بار گئی تو پھر تم تک کبھی لوٹ نہ پاؤں گی۔ کچھ فیصلے وقت کی بڑی اشد ضرورت ہوتے ہیں۔ لیکن ہم پھر بھی کسی ڈر یا شاید کسی احتیاط کی وجہ سے وہ فیصلے لینے سے ڈرتے ہیں لیکن وقت ہمیں مزید اُن مشکل فیصلوں کی طرف دھکیل رہا تھا۔

.................

مجھے اچانک یاد آ گیا کہ تم نے مجھے میرے برتھ ڈے پر کتنا خوبصورت سرپرائز دیا تھا یوں اچانک رات 12 بجے میرے کمرے کا دروازہ بجا کر......

''تم یہاں پر کیسے پہنچے؟''

''بھئی اس میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں کہ انسان تو چاند تک جا پہنچا ہے، تمہارے کمرے تک پہنچنا کون سا مشکل کام ہے۔''

تم میرے لیے چاکلیٹس لائے تھے اور خوبصورت سے پھول جو میرے کمرے میں پڑے پڑے سوکھتے گئے لیکن میں نے انہیں پھینکا نہیں بلکہ اپنے ساتھ جہیز میں لے آئی تھی تم نے کس قدر مذاق اڑایا تھا میرا۔ تم تو یہ پھول یوں لائی ہو جیسے اس کے بعد تمہیں پھول ملنا بند ہو جائیں گے۔''

میں مسکرا دی تھی لیکن اس کے بعد تو تم پھول دینا بھول ہی گئے تھے۔ سالگرہ ہو یا ویڈنگ اینیورسری۔ تمہیں اب پھول دینا یاد ہی کہاں رہتا تھا۔

.................

تم جانتے ہو مجھے تم سے کیا تھا جو ملنا بند ہو گیا تھا، تم ہمیشہ یہی سوچتے رہے کہ تمہاری معاشی کمزوری مجھے تم سے دور کر رہی ہے۔ نہیں ایسا نہیں تھا میں تو قدم قدم، جنم جنم تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی تھی لیکن تمہاری توجہ مجھ سے مٹ گئی تھی۔ شاید تمہاری محبت اب بٹ گئی تھی۔

.................

اور پھر وہ دن آن پہنچا جب تم نے طعنہ دیا کہ تمہیں چار رشتے بچانے ہیں اور مجھ سے محبت کے بدلے میں وہ رشتے گنوانا تمہیں قبول نہیں۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس روز جب میں تمہارے گھر سے رخصت ہوئی تھی تو میں ایک سے دو ہو چکی تھی۔

پھر میں نے سوچ لیا تھا کہ میں تمہیں چاہتی تو رہوں گی لیکن اب تم سے ملوں گی کبھی بھی نہیں یوں میں تمہیں تمہارے کیے کی سزا دوں گی۔

.................

مجھے اس سے محبت تو بہت تھی لیکن مرد جس سکون کے لیے شادی کرتا ہے وہ کچھ ہی خوش نصیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ میری پہلی شادی بھی ماں باپ کے تجربہ کی نظر ہو گئی تھی۔ ایک بیٹی بھی ہو گئی تھی لیکن زندگی میں سکون نام کی شے نہیں تھی۔ دفتر سے شام کو گھر کے لیے نکلتا تھا تو گھر میں قدم رکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں جان بوجھ کر اس کوشش میں رہنے لگا کہ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزار لوں۔ ہاں بیٹی سے پیار کر کے اسے کھلا کر خوشی تو ملتی تھی لیکن پھر بیوی کا چہرہ سامنے آ جاتا تھا جس پر ہر وقت صرف بارہ بجتے تھے۔ یار ایسے میں کس کم بخت کا دل چاہتا ہو گا کہ گھر جائے۔

اب بیوی کے ساتھ ہونے والی نوک جھونک کی توپوں کا رخ گھر کے باقی افراد کی طرف بھی جانے لگا تھا۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی میرے سگے نہیں تھے مجھے میرے تایا نے پالا تھا میرے ماں باپ میرے بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔ خیر بات اُن کے سگے ہونے یا نہ ہونے کی نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ گھر کا ماحول بڑا ہی تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

پھر ایسے میں جب گھر میں دل نہ لگتا ہو تو باہر تو دل بہلانا ہی پڑتا ہے۔ دو تین لڑکیاں میری زندگی میں آئیں، کسی کو بھی میری پہلی شادی کا علم نہیں تھا۔ میں ان سے شادی میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور شاید انہیں بھی مجھ سے ایسی کوئی توقع نہیں تھی اس لیے

میں غیر ضروری الجھنوں میں وقت نہیں گنوانا چاہتا تھا۔

گھر کے جھگڑے، بحث اور فضول کی مغز ماری کم تو نہیں ہو رہی تھی یا کم از کم میرا دھیان اب اس طرف کم ہی جاتا تھا۔ میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہوں، میں اپنی زندگی سے عاجز آ گیا تھا، شادی کسی خودکشی کی طرح لگنے لگی تھی جبکہ میرے اندر زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔

وقت یوں ہی گزرتا جا رہا تھا۔ اب بیوی کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے علیحدہ گھر چاہیے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں یہ نہیں کر سکتا اس کی ضد آہستہ آہستہ جنون میں بدل رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب ہماری شادی آخری سانسیں لے رہی ہے۔

ایسے میں میری زندگی میں تم آئیں۔ کسی روشن صبح کی پہلی کرن کی طرح اور آتے ہی میرے حواس پر چھاتی چلی گئیں۔ تمہارے خوبصورت کالے لمبے بال، چاندی جیسا رنگ، مناسب نقوش اور ذہانت مجھے اپنی طرف کھینچتے جا رہے تھے۔ میں تو بس بے بس ہوتا جا رہا تھا۔

پہلی ملاقات جو بظاہر سرسری سی ہونی چاہیے تھی، ہم نے 3 گھنٹے گفتگو میں گزار دیے، اس روز میں بالکل فریش ہو گیا تھا، ساری بک بک ذہن سے نکل چکی تھی۔ ہم جدا تو ہوئے تھے لیکن اگلی ملاقات کے وعدہ کے ساتھ۔

تمہارے ساتھ سفر بڑی تیزی سے کٹ رہا تھا۔ زندگی ایسے ہی آگے بڑھ رہی تھی میں اب عجیب مسائل کا شکار ہونے لگا کہ تم سے علیحدہ رہنے کا تصور محال ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف میری بیوی تھی جو میرے گلے میں پھندا ڈالے اُسے روز بروز ٹائٹ کر رہی تھی۔

مجھے نہیں اندازہ تھا کہ تمہارا میری پہلی شادی اور بیٹی کے بارے میں کیا Reaction ہوتا لیکن مجھے تم سے بہت زیادہ توقعات وابستہ ہو گئی تھیں۔ ان توقعات نے مجھ میں اتنا حوصلہ پھونک دیا کہ اس دن میں نے اپنی بیوی کو زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ میں مارنے دھاڑنے والا بندہ نہیں تھا لیکن اس عورت نے مجھے جنونی کر دیا تھا۔ ایک ہی چخ چخ بک بک سے میں تھک گیا تھا۔ اس دن پھر وہ رکی نہیں بس اپنا بوریا بستر اسمیٹا اور بیٹی کے ساتھ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

میں اپنی حرکت پر شرمندہ تھا لیکن اندر کہیں نہ کہیں خوش بھی تھا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ہر آدمی اندر سے کمینہ ضرور ہوتا ہے۔ مجھے بیٹی کے جانے سے دکھ تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اولاد کی صحیح تربیت صرف ماں ہی کر سکتی ہے۔ میرے اس منطق کے پیچھے بھی شاید کوئی گندی سوچ شامل تھی لیکن میں اس جنجال میں اب واپس نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

پھر اس روز میں نے تمہیں اپنی ماضی کی کتاب پیش کی تو تم نے کتنے بڑے دل سے اُسے پڑھا اور قبول کیا۔

ہمارے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ تم اور میں اب ایک ہونا چاہتے تھے اور وہ کیا محاورہ ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

..........

زندگی ایک نئے انداز سے شروع ہوئی۔ میں نے اس دوران اپنا محاسبہ بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کہیں زیادتی کر دی ہے۔ لیکن مجھے اس چیز کو سمجھنے کے لیے وقت درکار تھا۔ جبکہ اس کی طرف سے میری ذات پر، میرے گھر والوں پر حملوں کا سلسلہ تھم ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے شراب نوشی بھی شروع کر دی تھی۔ یہ بات رشتے کی بنیادوں کو اور ہی کمزور کرتی گئی تھی۔

بہرکیف میں نے سوچ رکھا تھا کہ مجھے اس دوسرے رشتہ کو نا صرف جوڑنا ہے بلکہ اس کو ٹوٹنے سے بچانا بھی ہے اور پھر ہم نے جلد ہی گھر والوں کی رضامندی سے نکاح کر لیا۔

میری پہلی بیوی کو میری دوسری شادی کی خبر نہیں تھی لیکن میری دوسری بیوی کو اس کا علم تھا اور مجھے تم پر بھروسہ بھی تھا، یقین تھا کہ یہ یقین کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

ہم ہنی مون کے لیے دبئی گئے تھے۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ تم نے ہنی مون سے پہلے مجھے میری بیٹی کی سالگرہ پر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میرے دل میں تمہارا مقام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ مجھے اپنے فیصلہ پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

دبئی سے واپسی پر زندگی معمول سے چلنے لگی۔ میری دماغی حالت اور میری دلی کیفیت دونوں ہی بدل چکی تھیں۔ مجھے دفتر سے نکل کر گھر پہنچنا اب اچھا لگنے لگا تھا۔ آدمی کو یہ احساس بڑی راحت بخشتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے گھر والوں سے بھی اتنا ہی پیار کرتی ہے، اور اس کے ماں باپ کی خدمت پر بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتی مجھے اپنے گھر کے ماحول سے تسلی ملتی تھی۔ تمہیں اس بات پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ میں ہر مہینہ اپنی بیٹی سے ملنے جاتا ہوں، بلکہ تم تو اس دوران مجھے فون یا میسج تک نہیں کرتی تھی۔ میں تمہاری وسیع قلبی کا دل ہی دل میں معترف ہو چکا تھا۔ مجھے ہر دن اپنے فیصلے پر پہلے سے زیادہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ ہر مہینہ ایک خاص رقم اپنی بیٹی اور بیوی کو بھیج رہا تھا۔ تمہیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا بلکہ تم نے تو یہ جاننے

کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ میں کتنی رقم بھیجتا ہوں۔ اور پھر تمہاری وہ قربانی میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ جب تم اپنا سارا سامان ایک کمرے میں بند کر کے 15 دن کے لیے اپنے ماں باپ کے ہاں محض اس لیے چلی گئی کہ میری بیٹی مجھ سے ملنے آ رہی تھی......

اور پھر مجھے وہ دن بھی یاد ہے......

''آج کھانے میں کیا ہے بیگم؟''

مجھے تمہاری طرف سے جواب نہیں ملا۔ ایسی خاموشی، ایسی اداسی اپنے گھر میں بڑے دنوں بعد دیکھ کر میں مرد ہو کر بھی ڈر گیا تھا۔

''میں کھانا نہیں بنا سکی کیونکہ......''

پھر تم نے میری طرف خالی نظروں سے دیکھا۔

''کیونکہ؟'' میں پریشان تھا۔

''کیونکہ آج اماں نے مجھے کھانا بنانے ہی نہیں دیا۔''

''ذرا اندازہ کرسکو تو کرو میرے دل پر اس لمحہ کیا کیفیت گزر رہی ہوگی۔ تمہارے اور میرے باقی گھر والوں میں ابھی تک کوئی ایشو نہیں تھا لیکن پھر اس روز کے بعد حالات بدلنے لگے۔

میں توقع کر رہا تھا کہ ان میں کچھ بہتری آ جائے گی۔ اس توقع کی بنیادی وجہ تمہاری مجھ سے وابستگی تھی لیکن مجھے آہستہ آہستہ اندازہ ہونے لگا کہ میں جو سوچ رہا ہوں ویسا نہیں ہے۔

......

''آج کچن میں بیلن نہیں تھا۔ آپ کی اماں نے وہ بھی چھپا دیا۔''

''آج آپ کی اماں نے مجھے طعنہ دیا کہ میں جہیز میں کچھ نہیں لائی۔''

''آج آپ کی اماں نے ہمسائیوں کے سامنے مجھے ڈانٹا، مجھ سے برا سلوک کیا۔''

تمہاری شکایات بڑھتی جا رہی تھیں اور ہماری آپس میں محبت گھٹتی جا رہی تھی۔ میں نے اب چپ سادھ لی تھی۔ میں بولتا تھا تو تمہاری آواز میری آواز سے بھی اونچی ہونے لگتی تھی کسی بھی مرد کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہیں کہ اس کی بیوی کی آواز اُس کی اپنی آواز سے اونچی ہو جائے۔ بس تمہارے جھگڑے میری ماں کے ساتھ بڑھ رہے تھے اور نتیجتاً میری توجہ اب تم سے ہٹ کر اپنی بیٹی اور اس کی ماں کی طرف جانے لگی تھی۔ میری پہلی بیوی نے کبھی بھی ڈائریکٹ میری ماں سے متعلق کوئی بیہودہ بات نہیں کی تھی لیکن تمہارا نشانہ ہمیشہ میری ماں ہوتی تھی۔ پھر میں نے اپنی بیٹی کو مہینہ میں دو بار ملنا شروع کر دیا۔ مجھے اب ایک فرار چاہیے تھا لیکن اس دفعہ میں ایک سیف فرار چاہتا تھا۔ میں اب غلطی پر غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

......

میں مرد تھا۔ ایک در بند ہوتا تھا تو دوسرا کھل جاتا تھا اور میں نے تو پہلا در ابھی پوری طرح سے بند بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ چیزیں میرے ہاتھ سے ایک بار پھر نکل رہی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا تھا لیکن حالات جس طرف جا رہے تھے مجھے وہاں ایک چیز پر اپنی گرفت کو قائم رکھنا ہی تھا۔

ہاں اس دن میری پہلی بیوی کی سالگرہ تھی، میری بیٹی اب ہم دونوں کے درمیان دوریاں مٹانا چاہتی تھی۔ میں ایسا نہیں چاہ رہا تھا لیکن تمہارا رویہ مجھے عجیب عجیب حرکتوں پر اکسا رہا تھا۔

یہاں بیوی کی سالگرہ تھی اور بیٹی کی فرمائش اور گھریلو ناچاقیاں......

اس روز بڑے طویل عرصہ بعد میں اپنی بیٹی کی ماں اور اپنی پہلی بیوی سے گھنٹوں بولتا رہا، وہ بھی بولتی رہی......اسے شاید اپنے کیے پر پچھتاوہ تھا۔

''اگر ہم ساتھ رہتے تو اتنا دور نہ ہوتے۔''

''اس روز غلطی میری تھی میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا''

''لیکن اکسایا بھی تو تم نے ہی تھا۔''

ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے ہم بہت قریب آ گئے۔ یا میں خود پر قابو نہ رکھ سکا، میں اب کہیں نہ کہیں تو اپنی گرفت قائم رکھنا چاہتا تھا۔

......

یہاں زندگی اسی طرح آگے جا رہی تھی، گھر میں بکواس، دفتر میں خواری، میں نے کوشش کی کہ حالات بہتر کرسکوں لیکن تمہارا رویہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

پھر اس روز تمہیں وہ خبر مل ہی گئی جس پر میں بڑے عرصہ بعد دل سے خوش ہوا تھا۔ باپ بننا وہ بھی بیٹے کا......آہ ایک بیٹے کا باپ بننا میری سب سے بڑی خوشی بن گئی۔

تم اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ یا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہزار جھگڑے تھے لیکن پھر بھی تمہارے ہوتے ہوئے کسی عورت کے ساتھ......

لیکن وہ عورت میری بیوی بھی تو تھی۔

......

اب اتنے عرصے بعد غالباً 3 سال بعد آج تمہیں دیکھا وہ بھی تمہارے بیٹے کے ساتھ تو اچھا لگا۔ دل میں کہیں کچھ ٹوٹا نہیں تھا بلکہ خوشی ہی ہوئی تھی کہ چلو تمہارے شوہر کے بعد تمہیں ایک سہارا تو مل گیا۔ ہاں پتہ چلا تھا تمہارے شوہر کی وفات کا۔ مگر مجھے تھوڑی سی حیرت اس بات پر ضرور ہوئی تھی جب میں نے تمہارے بیٹے کے چہرہ پر اسی جگہ تل دیکھا، جس جگہ میرے چہرے پر تل تھا۔

# گنہگار

محمد حسنین صابر/خیر پور ناے والی

نوری کے خاندان کو موضع محمد خاں میں آباد ہوئے صرف دو یوم ہی ہوئے تھے کہ اس حسین نوری کی خوبصورتی کے قصے موضع محمد خاں سے نکل کر آس پاس کے دیہاتوں میں بھی پھیلنے لگے۔ نوجوان کہنے لگے کہ اس جیسا حسین چاند پہلے نہیں دیکھا گیا اس زمین پر کبھی نوجوان نوری کے عشق میں دیوانے ہونے لگے تو میرے دل میں بھی اس حسینہ کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک سہہ پہر دماغی اور جسمانی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے میں دریائے ستلج کے کنارے جا پہنچا ستلج کے کنارے پر کچھ عورتیں تیرا کی کرتی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں سے اکثر چہرے میرے جانے پہچانے تھے لیکن ایک چہرہ اپنے قصوں سے بھی بڑھ کر حسین تھا۔ میں نے اندازہ کرلیا کہ یہی نوری ہے۔

کچھ دیر کے بعد لڑکیاں دریا سے باہر نکلیں۔ خشکی پر دائرے کی شکل میں بیٹھ کر ایک میٹھا گیت تالیاں بجا کر الاپنے لگیں۔ نوری کے روشن چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں بھی سحر تھا۔ اس سحر انگیز منظر کو دیکھ کر میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور دل کی دھڑکن ٹھیک کرنے لگا۔

لڑکیوں نے کچھ دیر کے بعد آنکھ مچولی کا کھیل شروع کر دیا۔ لڑکیاں چھپ گئیں۔ نوری انہیں ڈھونڈنے لگی۔ نوری کو ٹھوکر لگی اور وہ ایک جھاڑی کے قریب لڑکھڑاتی ہوئی گر گئی۔ جھاڑی کے قریب سیاہ رنگ کا بڑا ناگ پڑا تھا۔ ناگ نوری کی طرف بڑھنے لگا۔ نوری کے گلے سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں یہ منظر دیکھ کر رہا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا میں نے ناگ کی طرف بھاگ کر ناگ کی گردن دبوچ لی۔ ناگ طاقت ور تھا اس کی مجھ پر لپیٹ بڑی سخت تھی۔ مجھے اپنی ہڈیاں تڑختی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جلد ہی جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ میرے گلے سے کراہنے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ناگ کی گردن کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اب میرا یہ حال تھا کہ ناگ کی گردن سے میری تھوڑی سی گرفت بھی کمزور ہوتی تو ناگ مجھے اور زیادہ جکڑ لیتا اور میری گرفت مضبوط ہوتی تو ناگ کی گرفت کم ہو جاتی تھی۔ مجھے اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی بری طرح تھک چکا تھا اور ناگ کا سر مجھ سے چھوٹ کر مجھے ڈسنے ہی والا تھا کہ نوری کہیں سے درانتی لے کر وہاں پہنچی اور اس نے درانتی سے ناگ کی گردن کاٹ دی۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر لیٹا ہوا تھا۔ میرا گھر مرد اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے اوپر جھکے ہوئے لوگوں میں نوری بھی شامل تھی۔

اسی طرح پھلوں اور گلدستوں کے ہمراہ روزانہ نوری میری عیادت کو آتی رہی۔ ہماری دوستی بڑھتی گئی اور میں صحت مند ہوتا گیا۔ جتنی دیر نوری بیٹھی رہتی اس کی کوشش ہوتی کہ اس کی باتوں پر قہقہے لگاتا رہوں۔ کبھی وہ عورتوں سے دور بھاگنے والے مخبوط الحواس شخص جاوید چاچا کو زبردستی پکڑ لاتی اور اس کے منہ میں جبراً آم ٹھونسنے کی کوشش کرتی۔ وہ لعنت ملامت کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔ نوری ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی اور اس کی آنکھوں میں پانی جھلمل کرنے لگتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ نوری کی معصوم حرکتیں بھی روز روز بڑھنے لگیں۔

جناب خواجہ خدا بخشؒ صاحب کے عرس پر میں نے خیرپور اپنے دوستوں کے ساتھ جانے لگا تو نوری میرا سائیکل پیچھے سے پکڑ کر ضد کرنے لگی کہ میں بھی تمہارے ساتھ میلے پر جاؤں گی۔ مہربانی کر کے مجھے میجک شو اور استاد اللہ بخش کا تھیٹر دکھا دو۔ کیا یاد کرو گے تمہارے غریبوں کا کرایہ بھی میں ادا کر دوں گی۔ نوری نت نئے طریقوں سے مجھے تنگ کر کے خوش ہوتی رہتی۔

روزانہ کی ملاقاتوں نے بستی والوں، نوری کے والدین اور نوری کے عزیز و اقارب اور بستی کے زمیندار کو میرا مخالف بنا دیا تھا۔ بستی کے لوگ جو مجھ سے محبت کرتے تھے اب ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ بستی کے زمیندار جمیل شاہ نے بھی حسین نوری کا رشتہ مانگنے کی کوشش کی تھی لیکن نوری کے والدین نے نوری کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ زمیندار کو اس کا رنج تھا۔ ایک دن ضروری حاجت کے لیے کماد کے کھیت میں گیا تو بندوق کے فائر کی

آواز سنائی دی۔ میں باہر نکلا زمین پر زخمی نوری گری ہوئی لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کماد کی چھڑی پڑی تھی۔ شاید وہ کماد توڑنے کے لیے کھیت کے قریب آئی تھی۔ فائر کرنے والا نوری کا بھائی نور دین تھا اور ساتھ ہی زمیندار کا چالاک منشی بھی کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ گنہگار ہیں۔ اس کے بعد دو فائر مزید سنائی دیے۔ میرے سینے اور ٹانگوں میں گرم لوہا گھستا ہوا محسوس ہوا۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میں تحصیل ہسپتال کے بستر پر تھا۔ میں نے سنا کہ حسین نوری مر چکی ہے اور میں ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گیا ہوں۔

## حسن عباس رضا/اسلام آباد

بے وفائی کا دیا اُس نے حسن طعنہ مجھے
اور اب میں احتجاجاً بے وفا ہو جاؤں گا

---

تو بہت روئے گی، لیکن میں جدا ہو جاؤں گا
زندگی، اک روز میں تجھ سے خفا ہو جاؤں گا

آخری سیڑھی پہ جا کر تو پکارے گی مجھے
اور میں نیچے کھڑا تیری صدا ہو جاؤں گا

تو مصلّے پر مری نیت تو باندھے گی، مگر
میں نمازِ عشق ہوں، تجھ سے قضا ہو جاؤں گا

چاہتوں کے دائرے میں آؤ دوڑیں ایک ساتھ
تو نے مجھ کو چھو لیا، تو میں ترا ہو جاؤں گا

خود کو اک دن بانٹ دوں گا دشمنوں کے درمیاں
کم سے کم قیدِ انا سے تو رہا ہو جاؤں گا

سانپ اور سیڑھی کے اُلجھے کھیل میں اک روز میں
درمیانی مرحلے میں لاپتا ہو جاؤں گا

میں جسے کرتا رہا اپنی دعاؤں میں شمار
کیا خبر تھی میں اُسی کی بددعا ہو جاؤں گا

بے وفائی کا دیا اُس نے حسن طعنہ مجھے
اور اب میں احتجاجاً بے وفا ہو جاؤں گا

---

ماضی بھی میرے ساتھ ہی لپٹا رہا، تو پھر؟
میں تیرا ہو کے بھی، نہ ترا ہو سکا، تو پھر؟

تم مطمئن تو ہو مجھے میلے میں بھیج کر
اس بھیڑ میں کہیں میرا دل لگ گیا، تو پھر؟

گھر تو بنا رہی ہو مرے گھر کے سامنے
تم کو کسی نے چھت پہ نہ جانے دیا، تو پھر؟

سب جانتے ہیں کس طرح ٹوٹا ہوں تیرے بعد
یہ سانحہ دوبارہ ہوا رونما، تو پھر؟

خواہش تو ہے کہ ایک نیا بت بناؤں میں
وہ بت بھی ہو بہو تیرے جیسا بنا، تو پھر؟

رکھا ہے دل کی ساتویں تہہ میں جو رازِ عشق
تم سے کسی نے وہ بھی اُگلوا لیا تو پھر؟

کہہ تو رہی ہو چھوڑنے جاؤں گی موڑ تک
خود پر بھی اُس گھڑی نہ ترا بس چلا، تو پھر؟

تم آگ لا رہی ہو، کہ کچھ روشنی کریں
اس کھیل میں تمہارا حسن جل مرا، تو پھر؟

---

گزشتہ شب میری آنکھوں میں خواب تھا ہی نہیں
اور ایسی نیند سے بڑھ کر عذاب تھا ہی نہیں

ہمیں تو دکھ ہی پڑھایا گیا ہے مکتب میں
کہ دوسرا وہاں کوئی نصاب تھا ہی نہیں

کچھ اتنے رشک سے تکتے ہیں گل فروش تجھے
کہ جیسے باغ میں تجھ سا گلاب تھا ہی نہیں

غموں کو گنتے ہوئے ختم ہو گئی گنتی
مرے حساب میں ان کا حساب تھا ہی نہیں

گلی کے لوگ مجھے ایسے دکھ سے دیکھتے ہیں
کہ جیسے دوسرا خانہ خراب تھا ہی نہیں

اچانک اُس نے کچھ ایسے سوال پوچھ لیے
کہ میرے پاس کسی کا جواب تھا ہی نہیں

بھری ہوئی ہے لبالب انہی کے ساغر میں
حسن جنہیں کبھی ذوقِ شراب تھا ہی نہیں

---

آنکھ سے پھر نہ بہے گا دلِ برباد کا دکھ
جب پری زاد سمجھ لے گی انا زاد کا دکھ

یاد کرتا ہوں تو، تارِ رگِ جاں ٹوٹتی ہے
مار ڈالے گا کسی روز تری یاد کا دکھ

تختِ پرویز سے وابستہ تھا سکھ شیریں کا
کیسے کر سکتی تھی محسوس وہ فرہاد کا دکھ؟

نسل در نسل دکھوں کو کیا تقسیم، مگر
ختم ہونے کو نہیں آتا ہے اجداد کا دکھ

گھر میں رہ جاتے ہیں بس ڈوبتے سائے باقی
ورنہ ماں باپ کو کھا جاتا ہے اولاد کا دکھ

بہہ نکلتا ہے حسن آنکھ سے دجلہ اکثر
بھولتا ہی نہیں بربادیِ بغداد کا دکھ

---

یوں اچانک وہ آ ملا مجھ سے
عشق میں شرک ہو گیا مجھ سے

درمیاں رکھ کے فاصلے کی دلیل
لے لیا اُس نے فیصلہ مجھ سے

کچھ بھی باقی رہا نہ پھر مجھ میں
مجھ کو ایسے الگ کیا مجھ سے

رنج پھر دل کو روندنے آیا
پھر یہ مانگے گا راستا مجھ سے

کوئی تفتیش کار، تیرے سوا
کچھ برآمد نہ کر سکا مجھ سے

اک دیے کو پناہ کیا دی ہے
آندھیاں ہو گئیں خفا مجھ سے

اپنے ہمزاد سے رجوع کیا
تو ہوا جب گریز پا مجھ سے

اپنا غم ہی تھا مسئلہ میرا
جو کبھی حل نہیں ہوا مجھ سے

کل بڑے دکھ سے آئنے نے کہا
کب ملو گے حسن رضا مجھ سے؟

تمام بوجھ کہاں خاک داں پہ پڑتا ہے
کبھی کبھی تو قدم آسماں پہ پڑتا ہے
مجھے تو پیڑ کی چھاؤں نے روک رکھا ہے
وگرنہ ہاتھ تو ابرِ رواں پہ پڑتا ہے
یہ تیر یوں ہی نہیں دشمنوں تلک جاتے
بدن کا سارا کھچاؤ کماں پہ پڑتا ہے
تجھے زمین کے بارے میں علم ہے تو بتا
اس آسمان کا سایہ کہاں پہ پڑتا ہے
اِدھر میں پاؤں اُٹھاتا ہوں اور اُدھر گوہر
غبار سا صفِ سیارگاں پہ پڑتا ہے

ہم کو تو اُس نے پیاس بھی دریا مثال دی
پہلے بدن میں ریت بھری پھر نکال دی
میں تم سے ملنے آیا تھا چھاؤں کی آس میں
تم نے بھی اپنی دھوپ مرے سر پہ ڈال دی
مجھ پر کھلا کہ وہ تو رگِ جاں کے پاس ہے
میں نے یونہی تلاش میں دنیا کھنگال دی
ورنہ کہاں نگاہ میں جچتا یہ آدمی
اِس جانور کو شکل ہی تو نے کمال دی
گوہر مرا سفر تھا فقط اس زمین تک
پھر کس نے میری خاک فلک تک اُچھال دی

آئنہ جو کہہ رہا ہے اُس پہ حیرانی نہیں
دیکھنے کے واسطے آنکھوں میں ہی پانی نہیں
اپنے ہونے کی کوئی معلوم آہٹ دے مجھے
خامشی میں نے تری آواز پہچانی نہیں
فائدہ پھر کیا برستی بارشوں کے گیت کا
کھیت پر آئی ہوئی رُت ہی اگر دھانی نہیں
زندہ رہنا چاہتے ہیں سب کے سب مرنے کے بعد
جیسے یہ دنیا بھی کوئی عالم فانی نہیں
خواب نے ایسا دلاسہ دے دیا گوہر مجھے
نیند سے اُٹھ کر بھی اب کوئی پریشانی نہیں

سر سے کیا آسماں چلا گیا ہے
پاؤں سے خاک داں چلا گیا ہے
بجھ گئی رفتہ رفتہ آتشِ دل
سانس سے بھی دھواں چلا گیا ہے
بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے
میں کہاں تو کہاں چلا گیا ہے
نیند کی پیاس بجھ نہیں سکتی
خوابِ آبِ رواں چلا گیا ہے
موت تو اُن کو آئی ہے گوہر
جن کا نام و نشاں چلا گیا ہے

ماہ و انجم گئے جہاں میرے
ہیں وہیں سارے رفتگاں میرے
جب تلک یہ زمین گھومتی ہے
پاؤں ہوں گے رواں دواں میرے
خاک سے پوچھ کر بتاؤں گا
خال و خد ہیں کہاں کہاں میرے
میں بھی تیری زمیں کا حصہ ہوں
اب چھلک مجھ پہ آسماں میرے
جیسے تقسیم ہو گیا ہوں میں
تو بھی بٹ جائے گا مکاں میرے
خاک میں جب سے خستگی آئی
خود چٹختے ہیں استخواں میرے
جنگ تو دوسروں کی تھی گوہر
اور مارے گئے جواں میرے

ایک تو اور اک خدا ہے مرا
اس جگہ ورنہ اور کیا ہے مرا
خاک داں کم ہی پڑ نہ جائے کہیں
رقص کا دائرہ بڑا ہے مرا
تو مکمل کبھی نہیں ملتا
یہ دُکھ ہے یہی گلہ ہے مرا
شکر کرتا ہوں تم پلٹ آئے
یعنی پھر شہر بس گیا ہے مرا
مجھ میں وہ روشنی اُتر آئی
جس میں سورج بھی اک دیا ہے مرا
میری مٹی کو حسن ہے مرغوب
اس لیے عشق مشغلہ ہے مرا
اے پری زاد کچھ سہولت دے
عشق تجھ سے نیا نیا ہے مرا

کسی سے عشق نبھایا مجھے مزہ آیا
کہ اُس نے جتنا ستایا مجھے مزہ آیا
غرورِ حسن سنبھالے کہاں سنبھلتا ہے
وہ آئنے میں جو آیا مجھے مزہ آیا

# شاذ ملک/فرانس — زندگی ہے بہت حسیں لیکن — موت کی اپنی راحتیں جاناں

رائیگاں سب مسافتیں جاناں
بے ثمر ہیں رفاقتیں جاناں
درد تو دل سے آن ملتا ہے
کیا کریں پھر شکایتیں جاناں
کون جانے کہاں پہ ہوگا کیا
ناگہاں سب ہی آفتیں جاناں
رات کہتی ہے چاند تاروں سے
کیوں سحر سے عداوتیں جاناں
کون سمجھا ہے راز اُلفت کا
سب کی اپنی ہی چاہتیں جاناں
زندگی ہے بہت حسیں لیکن
موت کی اپنی راحتیں جاناں
شاذؔ کس موڑ پر بچھڑ جائیں
بھول جا سب عداوتیں جاناں

---

درد کا رنگ کتنا گہرا ہے
دل سمندر تو ذات صحرا ہے
روح کی گرہ کھول دیتا ہے
لب پہ اک چپ کا یہ جو پہرا ہے
دھڑکنو تم بتاؤ کچھ مجھ کو
دل کی بستی میں کون ٹھہرا ہے
میں تو کچھ بھی کہوں نہیں سنتا
دل یہ بہرا تھا اور بہرا ہے
بھید ہم پر کھلا یہ اب جا کر
رنگ یادوں کا کیوں سنہرا ہے
سب کی اپنی مسافتیں جاناں
راہ میں کس کی کون ٹھہرا ہے

---

بن کر موم پگھلنے والے تم ہی نہیں ہو ہم بھی ہیں
ہر سانچے میں ڈھلنے والے تم ہی نہیں ہو ہم بھی ہیں
کانٹوں بھری اس راہ پہ چلنا مشکل ہوتا ہے لیکن
عشق کی راہ پر چلنے والے تم ہی نہیں ہو ہم بھی ہیں
جیون تو اک کھیل ہے لیکن پیار تو کوئی کھیل نہیں
گر کر یار سنبھلنے والے تم ہی نہیں ہو ہم بھی ہیں
ہم بھی اُجالا کر لیتے ہیں شمع جلا کر یادوں کی
شام ڈھلے خود جلنے والے تم ہی نہیں ہو ہم بھی ہیں
کچھ شامیں اب بھی روشن ہیں دل کے آنگن میں اے شاذؔ
ماضی کے سنگ چلنے والے تم ہی نہیں ہو ہم بھی ہیں

---

زندگی پائے اور اجر کتنا
موت کو روک لوں مگر کتنا
سبز پتوں نے ساتھ چھوڑا تو
ٹوٹ کر رویا ہے شجر کتنا
بھول پائی نہ آج تک اس کو
یاد کا دل پہ ہے اثر کتنا
موسم یاد کی اُداسی میں
آنکھ بھٹکے گی دربدر کتنا
رنگ چاہت کے پڑ گئے پھیکے
ساتھ چل پائے ہم، مگر کتنا
حوصلے شاذؔ پوچھتے مجھ سے
اور باقی ہے اب سفر کتنا

---

## موسم

کچھ ادھورے سے اور کچھ پورے
ہم سے کچھ غم شناس دنیا میں
اپنے اندر ہی گم ہوئے کیونکہ
راس کب آئے ربط کے موسم
ہم بہاروں میں بھی خزاؤں کے
زرد پتوں کی شکل ہیں شاید
خامشی اوڑھ کر لیے دم سے
خاک آلود ہوتے رہتے ہیں
نارسائی طلب کے پلڑے ہیں
تول دیتے ہیں دل کو ہم یونہی
ٹوٹ کر گر بکھر بھی جائیں تو
جوڑ دیتے ہیں خود کو اشکوں سے
خود اُداسی کے حال میں بیٹھے
عمر یونہی گزار دیتے ہیں
جستجو کی جو ہم نے مرہم کی
ضبط کے ہاتھ آئے پھر موسم
رات آئے کب ربط کے موسم

# عاکف غنی/فرانس

انتہا تو دیکھیے میری نوائے شوق کی
میں طلوعِ روشنی تک خود بخود جلتا گیا

جوت کچھ ایسی محبت کی جگا دی جائے
آگ نفرت کی زمانے سے بجھا دی جائے
پھول گلشن میں وفاؤں کے کھلائے جائیں
زندگی پیار سے گلزار بنادی جائے
رکھ کے اخلاص کی بنیاد یہاں دھرتی پر
چین اور امن کی اک بستی بسا دی جائے
کر کے تعمیر محبت کے حسیں تاج محل
جو بھی دیوار ہو نفرت کی گرا دی جائے
ظرف کچھ ایسا ہمارا ہے دکھایا جائے
"دشمنِ جاں کو بھی جینے کی دعا دی جائے"
تم جو آئے ہو مرے گھر تو چلو یوں کر لیں
کیوں نہ تھوڑی سی تمہیں چائے پلا دی جائے
میرے گاؤں میں ہیں فطرت کے نظارے دلکش
آؤ اے جان تمہیں سیر کرا دی جائے
وہ جو دیوار ہے دوری کی دلوں کے مابین
ایک ہی پل میں محبت سے گرا دی جائے
خونِ دل دے کے چراغوں کو جلایا جائے
تیرگی، کیوں نہ تجھے آگ لگا دی جائے
میری تنہائی کا کچھ ایسے کیا جائے علاج
یادِ کی شمع مرے گھر میں جلا دی جائے
کچھ نہیں دل کو تسلی تو رہے گی عاکف
اس کی تصویر جو کمرے میں سجا دی جائے

---

حوصلہ کچھ پاؤں میں کچھ شوق میں رکھا گیا
اس طرح میں بے تکاں تیری طرف بڑھتا گیا
بے خبر دنیا و مافیہا سے ہو کے میں چلا
اپنی دھن میں گم رہا رستہ مرا کٹتا گیا
اک نشانِ راہ تھا نظروں میں میری دوستو
سوئے منزل اس نشانِ راہ پہ چلتا گیا

انتہا تو دیکھیے میری نوائے شوق کی
میں طلوعِ روشنی تک خود بخود جلتا گیا
ایک تو ہے، تو ہی تو ہے منتہائے آرزو
اس سے آگے اور تو کچھ بھی نہیں سوچا گیا
اس زمیں پر آزمائش کے لیے اترے ہیں ہم
اس سے پہلے آسماں پر بھی ہمیں پرکھا گیا
یہ محبت تو بڑی آسیب ہے عاکف غنی
مبتلا جو ہو گیا بچتا نہیں دیکھا گیا

---

اِک وہ ہے کہ جو تیری محبت میں مرے ہے
اِک تو ہے کہ بس جور و ستم روز کرے ہے
اک عمر کہ گزری ہے جو پردیس میں اپنی
اک دل ہے کہ بس دیس کے کوچوں میں پھرے ہے
منزل تو بہت دور بہت دور ہے لیکن
تو ہے کہ ابھی تھک کے سرِ راہ رکے ہے
چھایا ہے یہاں یاس کا ہر اور اندھیرا
امید کا اک دیپ مگر اب بھی جلے ہے
وہ حسن کی پریا نہیں کچھ اور بلا ہے
جو سوچ سے بھی دور کہیں اور پرے ہے
صد شکر کہ اس ایک ہی کے در کا گدا ہوں
بن مانگے بھی دامن مرا جو روز بھرے ہے
نومید نہیں ہوتا کبھی حضرتِ عاکف
تم دیکھتے جانا کہ خدا خیر کرے ہے

---

کچھ اس طرح سے لاج یہ رکھنا پڑی ہمیں
اس کے بغیر زیست یہ کرنا پڑی ہمیں
تم بھی تلاشِ نور میں نکلے تھے ہاں مگر
خود کو جلا کے روشنی کرنا پڑی ہمیں
یوں تو غریقِ عشق تھے دونوں ہی دہر میں
تنہا شبِ فراق پہ سہنا پڑی ہمیں

آئے تھے زد پہ دونوں ہی الزام کی مگر
قیمت یہ خود کو مار کے بھرنا پڑی ہمیں
وہ جس کو چھوڑ آئے تھے ہم بھیڑ بھاڑ میں
مڑ مڑ کے راہ اس کی ہی تکنا پڑی ہمیں
عاکف رہِ وفا میں کہاں وصلِ یار بس
کچھ لذتِ فراق بھی چکھنا پڑی ہمیں

---

میں دریا ہوں کہیں رکتا نہیں ہوں
ابھی تک حوصلہ ہارا نہیں ہوں
مجھے تم داد دو اس حوصلے پر
بچھڑ کے تم سے میں رویا نہیں ہوں
نہیں ہرگز نہیں ، ایسا، نہیں ہے
کسی کی آنکھ کا سپنا نہیں ہوں
لگن منزل کی کچھ ایسی ہے من میں
میں تھک بھی جاؤں تو رکتا نہیں ہوں
نہیں کرتا بلند و بانگ دعوے
جو کر سکتا نہیں ، کہتا نہیں ہوں
مری تکمیل ہوگی جانے کب تک
ابھی تک چاک سے اترا نہیں ہوں
کسی کی یاد نے رکھا ہے یکجا
میں ٹوٹا ہوں مگر بکھرا نہیں ہوں
نہیں عادت مجھے رونے کی یارو
میں اپنے دُکھ بیاں کرتا نہیں ہوں
کسی کے عشق میں کھویا ہوں ایسے
''میں اپنا ہو کے بھی اپنا نہیں ہوں''
بہت سے کام کرنے کو ہیں باقی
میں عاکف بس یونہی زندہ نہیں ہوں

# عبیداللہ نزاکت/فرانس

نہ پوچھ کیسا خزانہ پڑا ہے میرے پاس
کسی کا لمس کسی کی دعا ہے میرے پاس

نام: عبیداللہ نزاکت، تعلیم: ایم اے اُردو، شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔ پسندیدہ صنف: غزل۔ جنرل سیکرٹری بزمِ شعور، حاصل پور

میں برگ برگ نئی رنگتوں میں ڈھلنے لگا
وہ ایک لمس مری کیمیا بدلنے لگا
حسد میں ڈوبی ہوئی رات وار کرنے لگی
مرے لبوں پہ دعا کا چراغ جلنے لگا
ڈھلی جو دھوپ مری خواہشیں سلگنے لگیں
ہوئی جو شام تو آنکھوں میں دل پگھلنے لگا
میں ڈر رہا تھا بہت واہموں کے جنگل میں
سو کوئی دھیان مرے ساتھ ساتھ چلنے لگا
یہ کس نے دیکھ لیا دل نواز آنکھوں سے
کہ دل میں پھر سے تمنا کا پیڑ پھلنے لگا

نہ پوچھ کیسا خزانہ پڑا ہے میرے پاس
کسی کا لمس کسی کی دعا ہے میرے پاس
تجھے کہا تھا زمانے کسی فقیر سے مل
تو پھر بھٹکتا ہوا آ گیا ہے میرے پاس
میں صرف کاسہ نہیں خواہشیں بھی پھینک دیا
یہی بہت ہے کہ نامِ خدا ہے میرے پاس
مجھے تو خاک کی خوشبو نے کر لیا ہے اسیر
تو کس اُمید پہ بیٹھا ہوا ہے میرے پاس
یہ پھول ہنستی ہوئی تتلیوں کا گھر تھا عبیدؔ
یہ پتیاں نہیں، ملبہ پڑا ہے میرے پاس

نہیں کہ تھوڑا سا رختِ سفر اُٹھانا پڑا
وہ ہجرتیں تھیں کہ کاندھوں پہ گھر اُٹھانا پڑا
یہ میرے خواب نہیں تھے کہ پھینک دیتا کہیں
یہ تیرا ہجر تھا سو عمر بھر اُٹھانا پڑا
مرے وجود مری ناتوانی اپنی جگہ
اُٹھا بھی لوں گا ترا بوجھ اگر اُٹھانا پڑا
میں اس سے جنگ کے حق میں کبھی نہ تھا پھر بھی
مرے عدو کو ہزیمت کا ڈر اُٹھانا پڑا
پڑا تھا کب سے مرا سنگِ خواب نقش طلب
سو مجھ کو تیشۂ دستِ ہنر اُٹھانا پڑا

مکانوں، مسجدوں، باغوں، بنوں میں پھیل گیا
وہ اِسم زیست کے سب سلسلوں میں پھیل گیا
یہ کیسی چپ ہے جو گلیوں میں خاک اُڑانے لگی
یہ کیا سکوت ہے جو راستوں میں پھیل گیا
میں چھو کے دیکھنے والا تھا اس کی خوشبو کو
وہ رنگ بن کے مہکتی رُتوں میں پھیل گیا
بجھے ہوئے تھے بڑی دیر سے پھر ایسا ہوا
کوئی اُجالا ہماری رگوں میں پھیل گیا

ایسا نہیں کہ بابِ عطا دیر سے کھلا
مجھ ہی سے قفلِ دستِ دُعا دیر سے کھلا
افسوس میں بچا نہ سکا اپنے آئینے
مجھ پر مزاجِ خلقِ خدا دیر سے کھلا
ہے تیری جستجو کا مجھے بے حساب رنج
دنیا ترا وجود ہے کیا دیر سے کھلا
دل سے لگائے رکھا یقیں کی طرح جسے
وہ تو کوئی گماں بھی نہ تھا دیر سے کھلا
وہ تو ہماری اپنی خموشی کا تھا فریب
کوئی نہیں تھا محوِ صدا دیر سے کھلا


معروف شاعر
خالد مسعود کا دوسرا شعری مجموعہ
بے ساختگی
مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے
ناشر: نستعلیق مطبوعات، اُردو بازار لاہور

نامور شاعر، سیرت نگار اور محقق
تفاخر محمود گوندل کا نعتیہ مجموعہ
تقدیس
مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے
ناشر: نستعلیق مطبوعات، اُردو بازار لاہور

# ایشیا کا وینس

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ/گوجرانوالہ

میری آنکھیں دکھ رہی تھیں اور سر بوجھل تھا۔

گو کہ تھائی ایئر ویز کی یہ پرواز بہت لگژری قسم کی سواری تھی۔ چند ڈاکٹروں پر مشتمل ہمارا یہ گروپ ہانگ کانگ میں ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے عازم سفر تھا جس میں ابھی ایک روز باقی تھا اس لیے دوستوں کا خیال تھا کہ ہانگ کانگ (جسے عرب لوگ ''وڈیا کر'' ہونج کونج بھی کہتے ہیں) سے فیری پر میکاؤ کی سیر بھی لگے ہاتھوں ہو جائے جسے عرف عام میں ایشیا کا وینس کہتے ہیں۔

میں نے جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی سونے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ اسلام آباد ایئر پورٹ سے چلتے ہوئے رات کا ایک بجنے کی نوید سنائی جا رہی تھی۔ فلائیٹ کے نارمل ہوتے ہی تھائی فضائی میزبان سُرخ اور ہلکی براؤن رنگ کی بوتلوں میں بھری آبِ رز کو کھڑکاتی ہوئی آ گئی۔ میں نے اُسے اپنی زبان میں بتایا کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اس لیے اے نیک دل خاتون مجھے تھوڑا سا جوس پلا دے۔ یہی خاتون جو ساڑھی سے ملتا جلتا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی ذرا سا جھک کر ہر مسافر کو کہہ رہی تھی ''سواڈیکا'' میں نے اس سے انگلش میں ان الفاظ کے معانی پوچھے تو پتہ چلا خوش آمدید سے ملتے جلتے ہیں۔ اپنی مزاحیہ طبیعت کی وجہ سے میں نے کچھ اور جھک کر بلکہ کافی حد تک رکوع میں جا کر فضائی میزبان کو جواباً لہک لہک کر کہا تھا ''سواڈیکا''

اب ہم لکھنؤ کے اوپر محوِ پرواز تھے اور میرے تعاقب میں یہ رت جگا تھا۔ میرے ساتھی ایک پٹھان ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اس بدنام زمانہ ٹرالی کو نیم باز آنکھوں سے دیکھا اور وہسکی پی گئے۔ لاہور کی ایک فیملی ہم سے آگے براجمان تھی۔ اس فیملی کے ایک لڑکے نے بھری چھلکتی بوتلیں دیکھ کر حلق سے بل کھاتی ہوئی باآواز بلند ''استغفراللہ'' کی آواز نکالی۔ خاں صاحب اک اور جام لنڈھا چکے تھے۔

میں نے سرزنش کی تو کہنے لگے: ''اچی اوتی ہے چہ'' (اچھی ہوتی ہے)

اگلے روز ہانگ کانگ میں بولائے بولائے پھرتے مثانے میں درد کی شکایت بھی کر رہے تھے اور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے:

آتے ہیں کل سے ''دھات'' کے قطرے پیشاب میں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں سائیڈ بٹن لگا کر موسیقی سُن کر وقت گزارنا چاہتا تھا مگر وہ نہ جانے کس ملک کی موسیقی اور زبان تھی جو سر درد میں اور معاون ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے سیٹ پیچھے فولڈ کر کے اک بار پھر سونے کی کوشش کی تو لاہور والی فیملی کا کوئی شیر خوار بچہ رونے لگا۔ کافی دیر بچے نے شور شرابا جاری رکھا تو میں نے سیٹ سے اُٹھ کر کہا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟

مگر لاہور والی فیملی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ساتھ والی سیٹوں پر گروپ فیلو باجماعت خراٹے لے رہے تھے۔ وقت گزاری کے لیے رسالہ پڑھنا شروع کیا مگر تھائی لینڈ کی زبان پلے نہیں پڑی۔ ہر صفحے پر زیر زبر پیش اور ججے سے لکھی ہوئی ہے۔

بنکاک کے عالمی ہوائی اڈہ سے ہمیں ہانگ کانگ کے لیے فلائٹ لینا تھی۔ بنکاک انٹرنیشنل ایئر پورٹ (جس پر پچھلے دنوں دسمبر 2008 میں 10 لاکھ شہریوں نے قبضہ کر لیا تھا) بہت خوبصورت ہے۔ Tunnel یعنی سرنگ نما بہت لمبی چوڑی عمارت ہے جس کے پہلو سے بہت سی ٹہنی نما شاخیں نکلتی ہیں۔ جس کے ساتھ Vestibule کے ذریعے جہاز آ کر لگ جاتے ہیں اور جانی پہچانی منزلوں کی طرف اُڑ جاتے ہیں۔ یہاں D-10 گیٹ کے پاس ہمارا 3 گھنٹے کا Stay تھا۔ پاس ہی انڈین سکھ بیٹھے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں گوجرانوالہ سے ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ بڑی دلچسپ باتیں کرتے رہے جو پوری ایک سفرنامے کی قسط کی متقاضی ہیں۔ ایک سکھ جو کالیاں کی پیدائش تھا میں نے اسے بتایا کہ جو کالیاں دریائے چناب کے کنارے اب ایک بڑا قصبہ ہے اور ہمارے گاؤں کے قریب ہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مستنصر حسین تارڑ صاحب بھی یہیں کے رہنے والے ہیں تو اُس نے زور سے کہا ''چھچھا'' اور اس کے آخری الف کو کافی لمبا کھنچا۔

بنکاک سے ہماری Connected فلائٹ اُڑی تو نیچے دیکھ کر پتہ چلا کہ بنکاک کے اردگرد ہماری طرح دور دور تک زرعی علاقہ ہے اور وہاں

فصل بوئی ہوئی ہے۔ فضائی میزبان نے کھانے کا پوچھا تو دعا کی یا اللہ مجھے حرام خوری سے بچا اور اُس خاتون سے عرض کیا کہ ٹوٹے پھوٹے مسلمان ہیں مسلم فوڈ ہی لا کر دے دے۔ ساتھ والی سیٹ پر نظر پڑی تو دیکھا بوائے کٹ بالوں والا ایک لڑکا بیٹھا ہوا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکا نہیں ماں ہے اور سرعام اپنی چھاتیوں سے اپنے شیر خوار بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ پھر دعا کی یا اللہ یہ حرام خوری تو بہر حال نہیں پر اس منظر سے بھی بچا۔

بلند و بالا عمارتوں اور سکائی سکر یپرز کے شہر بے مثال ہانگ کانگ سے گولڈن ڈول نامی فیری پر سوار ہونا ایک خوشگوار حیرت کا سماں ہے۔ میں نے یوں تو بہت سے بیرونِ ملک سفر کیے۔ فیری کا سفر اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سمندری جہاز ہے جس پر ڈھائی سو کے قریب مسافر سوار ہیں۔ فیری ہانگ کانگ کے شہر کی بلند و بالا عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی تیزی سے سمندر کا سینہ چیر رہی ہے۔ خوش قسمتی سے سمندر پُرسکون ہے۔ ورنہ طوفان کی صورت فیری سروس کینسل بھی ہو سکتی تھی۔ ہانگ کانگ کی سب سے بلند عمارت بنک آف چائنا کی ہے۔ اس کی اُوپر والی منزل میں نقرئی برچھیاں سی لگی ہیں۔ ہانگ کانگ کے اردگرد یا شہر میں کہیں بھی جائیں یہ عظیم و بلند عمارت آپ کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑی ہوتی ہے۔ اب یہ منزل بہ منزل ہم سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم سے کوئی ایک سمندری میل دور دوسری فیری جا رہی ہے۔ اس کے پیدا شدہ لہروں کی وجہ سے ہماری فیری مست شرابی کی طرح جھوم رہی ہے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر راحیل جن کا تعلق گجرات سے ہے بیٹھے ہوئے کہہ رہے تھے ؏

جھوم برابر جھوم شرابی

میں نے ان کی بائیں پسلی میں ٹہوکا دے کر کہا ''راحیل بھائی! جھومے گا تو برابر کیسے رہے گا؟''

تھوڑی دیر بعد ہی بارش شروع ہو گئی جو ساتھ والی کھڑکی پر پڑتی ہے تو بہت بھلی لگتی تھی۔ میدانی علاقوں کی بارش بھی خوبصورت ہوتی ہے مگر سمندری بارش خوبصورت ترین تھی۔ سامنے ایک دو اور چھوٹے جزیرے آئے مگر یہ بڑی فیری ہمارے پنجابی محاورے کے مطابق چھوٹے ''ٹیشنوں'' پر کہاں رکتی تھی۔ میکاؤ جا کر لنگر انداز ہوئی تو ایک بڑے سمنٹ شدہ پلیٹ فارم پر اُترے جو کہ واقعی شدہ تھا یعنی سادہ مرادا تھا۔

میکاؤ کے امیگریشن حکام بہت سخت نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ کہیں ہم مستقل طور پر میکاؤ نہ رہ جائیں انہیں لاکھ کہا کہ پاکستان میں ہمارے اپنے ہسپتال ہیں یہاں رہ کر کیا کریں گے؟ ہمارے گروپ لیڈر نے سب کو ٹکٹیں اور پاسپورٹ لانے کو کہا۔ ہم نے اپنے سفاری سوٹ کی ساری جیبیں دیکھ ڈالیں مگر پاسپورٹ اور ضروری کاغذات گم ہو چکے تھے۔ اپنے جسم و جاں کے سبھی پوشیدہ و پیچیدہ حصے بھی چھان مارے مگر پاسپورٹ اور ٹکٹیں ندارد۔ اصل میں اب ٹکٹ چھوٹی بک لیٹ کی بجائے تین اوراق پر مشتمل ہوتی ہے۔ بسیار کوشش مگر کاغذات ندارد اس لیے زیر لب کہا:

گاہ تیری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود<br>
گاہ اُلجھ کر رہ گئی تیرے ہی کاغذات میں

ایک دو گھنٹے گزرے چار گھنٹے گزر گئے۔ امیگریشن والے مان ہی نہیں رہے تھے۔ پاکستان کے پاسپورٹ دیکھ کر ہی پریشان ہو جاتے۔ ہم میں سے ہر ایک کو دہشت گرد سمجھتے تو دکھ ہوتا۔ کھڑے کھڑے پاؤں اکڑ گئے۔ ہمارے سامنے کئی بار بہت سے غیر ملکیوں کے جھنڈ آئے ٹھپیاں لگیں اور یہ جا وہ جا۔ تھک ہار کر سامنے موجود ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دو سیکورٹی گارڈ آ گئے اور بڑی رواں دواں انگریزی میں لڑنا شروع کر دیا کہ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ آپ کیو میں سے نکل کر یہاں کیوں آئے۔ ہم نے بھی اسی روانی میں عرض کیا کہ دم لے کے ایک لحہ چلے جائیں گے۔ فقیر سن کر تمہارے خلق کی تعریف آ گئے تھے۔ جا کر پھر کیو میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں سیکورٹی گارڈ پاس سے گزرے تو یہ سن کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اور طوطیاں اُڑ گئیں کہ دونوں ٹھیٹھ پنجابی بول رہے تھے۔ ہم نے دونوں کو بلا کر پوچھا ''کتھے رہندے او'' تو وہ بولے ''گوجرانوالہ میں بجتے والے محلے''

''تے ماما فیر چھی لا کے مل لڑدا کیوں سیں؟''

ہم نے بغل گیر ہو کر کہا۔ ان سے پتہ چلا کہ دونوں دوست تلاشِ روزگار میں میکاؤ آئے اب یہاں 25 خاندان آباد ہیں اور اب تو اپنی مسجد بھی بنالی ہے۔ ان کے کہنے پر امیگریشن والوں سے جان چھوٹی۔ سامنے ہی ہماری ٹورسٹ بس کھڑی تھی۔ ہماری گائیڈ کیتھی نے خوش آمدید کہا۔ گو کہ اس مائی کی عمر 61 سال تھی مگر بڑی پھرتیلی تھی۔ ایک پٹھان دوست نے اسے دیکھتے ہی کہا ''اگر تو مائی نہ ہوتی تو مائی ڈیئر ہوتی''

میکاؤ شہر کی خوبصورتی دیکھ کر ساری تھکن اور رت جگے کی کوفت دور ہوگئی۔ شہر کے مختلف حصوں کو ملانے کے لیے سمندر میں بھی فلائی اوور بنائے گئے ہیں۔ میکاؤ کا ایئرپورٹ ہمارے سامنے تھا۔ یہ اس لحاظ سے دنیا کا منفرد ایئرپورٹ ہے کہ اس کا رن وے سمندر میں ہی بنایا گیا ہے۔ جب یہاں فلائٹ لینڈ کرتی ہے تو بہت ہی عجیب محسوس ہوتا ہے۔ یعنی ایسے لگتا ہے جیسے جہاز سمندر میں ہی اُتر کر تیر رہا ہے۔ میکاؤ شہر کے شروع میں ایک قدیم طرز کا خوبصورت قلعہ نظر آتا ہے۔ باقی عمارتیں ملٹی سٹوری ہیں۔ یہاں دنیا کے سب سے مہنگے ہوٹل ریسٹورنٹ اور کسینو یعنی جواء خانے ہیں۔ بہت سی عمارتیں عام ڈگر سے ہٹ کر بنائی گئی ہیں۔ یعنی انسانی ہاتھ کی شکل کی عمارت گنارا، کنول کے پھول کی شکل کی کثیر منزلہ عمارتیں دور سے دیکھیں تو نظر کو بہت بھلی لگتی ہیں۔ دنیا میں تین ملک ایسے ہیں جہاں ننگے پیر چلنا قانونی طور پر منع ہے۔ ان میں میکاؤ وینس اور سپین شامل ہیں۔ بڑے ہوٹلوں میں آپ سوٹ اور ٹائی یا پورے ڈریس کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو بس اتنا یاد تھا کہ ایک بار ورلڈ کپ ہاکی میں لاہور میں میکاؤ کی ٹیم کو ہم نے مبلغ 58 گول سے شکست دی تھی۔

یہ 8 اگست کا دن تھا۔ اس روز 8 بج کر آٹھ منٹ اور 8 سیکنڈ پر چائنا اولمپکس کا افتتاح ہوا تھا۔ کیونکہ چینی لوگ 8 کے ہندسے کو لکی خیال کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ چونکہ عالمی کھیلوں کے اس اولمپک مقابلے میں Co-Host سٹی ہے اس لیے وہاں اور میکاؤ میں سیکورٹی اس روز سخت تھی۔ آبادی تک پہنچنے کے لیے سمندر کے نیچے موجود سرنگ سے ہماری بس گزری تو سامنے ہی نیلگوں شفاف آسمان اور میکاؤ تھا۔ اس سے ذرا آگے سمندر اور پھر چین کا وہ علاقہ جہاں اولمپکس ہو رہے تھے۔ سامنے ہی بہت بڑا چمکدار لیڈی بُدھا کا مجسمہ تھا۔ ہمارے علم کے مطابق تو گوتم بدھ کپل وستو کے راجہ کا بیٹا تھا اور سدھارتھ نام تھا۔ یہ لیڈی بُدھا نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی؟ میکاؤ کا یہ جزیرہ 1999 میں چائنا کی عملداری میں آیا۔ آج کل یہاں کے گورنر سٹینلے کاک ہیں۔ بہت امیر اور رنگین مزاج شخص ہیں۔ عیالدار بھی ہیں اور کئی بیویوں کے شوہر نامدار ہیں۔ قریب ہی میکاؤ ٹاور تھا۔ یہ 338 میٹر اونچا مینار ہے جس کا آخری سرا ڈسپوزیبل سرنج کی طرح ہے۔ جی ہاں ظاہر ہے ہم ڈاکٹر ہیں ہر چیز کو ڈاکٹری نظر سے ہی دیکھیں گے۔ سٹینلے صاحب نے یہ ٹاور اپنی بیوی نمبر 2 کے نام لکھ دیا ہے۔ پھر ہم ایک Pink ہاؤس کے پاس سے گزرے۔ بڑی پیاری عمارت ہے۔ میکاؤ کا گورنر ہاؤس یہیں پر ہے۔ میکاؤ کا 500 سال پرانا تاؤ ٹیمپل اس سے ذرا آگے واقع ہے تاؤ ازم کے ماننے والے یہاں بے شمار ہیں۔ کوئی بڑا عجیب و غریب قسم کا مذہب ہے۔ منتیں ماننے والے کافی لوگ یہاں موجود تھے۔ لمبی گول گول اور انواع و اقسام کی اگربتیاں یہاں جل رہی تھیں۔ ایک بڑا سا ٹل تھا جسے ہر زائر جا کر کھڑکاتا تھا اور ساتھ ہی پڑا مقدس پانی نوشِ جاں کرتا تھا۔

عمومی لوگ پرتگالی بولتے ہیں۔ چین کے بادشاہ نے صدیوں پہلے میکاؤ پرتگالیوں کو جاگیر کے طور پر بخش دیا تھا۔ 1999 میں پرتگالیوں سے آزادی کے بعد یہاں Mix نیشن آباد ہوئیں۔ اس لیے یہاں چین یا ہانگ کانگ کی بجائے اونچی ناک اور موٹی آنکھوں والے لوگ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

عموماً دکانوں پر بورڈ پرتگالی زبان میں ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے رنگین اور ہوشربا کسینو میکاؤ میں ہیں۔ سب سے بڑا کسینو وینلشیا ہے۔ لوگ دور دور سے قسمت آزمانے آتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے بھی مبلغ 300 ڈالر وہاں سے جیتے۔ ہم نے پھر دعا کی کہ انجانے دیس اور نظارے دیکھنے آئے ہیں یا اللہ حرام خوری سے بچا۔

میکاؤ کا رقبہ پہلے پہل 2 مربع میل تھا۔ اب 9 مربع میل ہوگیا ہے۔ بس یہی سوچ بار بار آتی تھی کہ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس نے ٹورازم کی وجہ سے بہت سا زرِ مبادلہ کمایا۔ یہاں کوئی فصل نہیں اُگتی۔ کوئی معدنیات نہیں ہیں جس کے برعکس میرے وطن میں لاکھوں کروڑوں ایکڑ پر دھان اور گندم کی فصل بوئی جاتی ہے۔ مگر عوام آٹے دال کو ترستے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں کی سیاحت کے دوران ایک ٹورسٹ نے مجھے بتایا کہ دنیا کے 50 اونچے پہاڑوں کے نام لیں تو ان میں سے 47 پاکستان میں ہیں جیسے راکا پوشی کے ٹو، ترچمیر نانگا پربت اور چیلاس کی پہاڑیاں۔ مگر افسوس کہ ہم نے اپنے شمال کو بارود سے بھر کر اپنا اربوں روپے کا نقصان صرف اور صرف سوات کے سلسلے میں ہی کر دیا ہے۔

(سفرنامہ ''مسافر ہوں یارو'' سے)

# کوالالمپور سے کلنگ تک

یونس وریام/لاہور

کلنگ، سرکاری طور پر کلنگ کا شاہی قصبہ (ملائی زُبان میں: Bandar Diraja Klang) شاہی قصبہ ہے اور ریاست سیلانگور کا پُرانا دارالحکومت ہے۔ یہ ضلع کلنگ کے ساتھ واقع ہے۔ یہ کوالالمپور اور موجودہ دارالحکومت ''شاہ عالم'' میں ضم ہونے سے قبل قدیم زمانہ میں سیلانگور کا شہری دارالحکومت تھا۔ پورٹ کلنگ جو ضلع کلنگ میں واقع ہے دُنیا میں بحری جہازوں کی آمدورفت کی تیرہویں مصروف ترین بندر گاہ اور دُنیا میں سولہویں مصروف ترین جگہ ہے۔

کلنگ میونسپل کونسل (ms) یا PM ضلع کلنگ کے اکثریتی علاقہ کا اِنتظام سنبھالتی ہے جب کہ شاہ عالم سٹی کونسل کے ذِمے ضلع کلنگ کے مشرق، ضلع پیٹالنگ کے جنوب اور شاہ عالم سمیت سیلانگور کے دیگر علاقوں کا اِنتظام سنبھالنا ہے۔

2010ء کے اعدادوشُمار کے مطابق کلنگ شہر کی کُل آبادی 240,016 تھی جس میں سے (10,445 وسطی شہر) میں تھی جبکہ ضلع کلنگ کی آبادی 842,146 ہے اور تمام قصبے جن کا اِنتظام کلنگ میونسپل کونسل سنبھالتی تھی اُن کی تعداد 744,062 ہے۔

3 جون اور ہفتے کا دن تھا جب ہم نے ملائیشیاء کی سرزمین پر صبح 7.15 ایمیگریشن وغیرہ کی کاروائی مکمل کرنے کے بعد ایرپورٹ کے باہر ٹیکسی لینے کی غرض سے قدم رکھا پہلے تو اتنے بڑے ایرپورٹ پر کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ ہم نے جانا کس طرف ہے کافی دیر تک کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ یہاں سے ہم نے باہر کیسے جانا ہے کہ ایک دو وردی میں ملبوس ملازم نظر آئے تو ان سے میں نے انگریزی میں پوچھا کہ باہر جانے کے لئے کونسا راستہ ہے وہ سر ہلا کر آگے نکل گئے مجھے ایک دم پیرس چارلس ڈیگال ایرپورٹ کا وہ قصہ یاد آ گیا کیونکہ 1998 میں جب میں پیرس میں ہونے والی جرنلیسٹوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تو اس وقت بھی میرے ساتھ ایسا ہی ہوا کہ ایرپورٹ سے باہر آ کر جب میں نے ٹیکسی سٹینڈ پر کھڑے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے انگریزی میں ہوٹل کا ایڈریس پوچھا تو اس وقت بھی اس ڈرائیور نے منہ پھیر لیا تھا جو کہ بعد میں پتہ چلا کہ فرانس میں فرنچ بولی جاتی ہے اور کیونکہ فرانسیسی انگریزوں سے آزاد ہوئے تھے اس وجہ سے وہ انگریزوں اور انگریزی دونوں سے نفرت کرتے ہیں بالکل وہی حال مجھے یہاں دیکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ یہ ملائی لوگ بھی تو پہلے انگریزوں سے ہی آزاد ہوئے تھے مگر یہاں پر وہاں سے صورت حال الگ دیکھائی دے رہی تھی یہاں تو ان کی اپنی زبان ملائی ہے اور ان میں سے پڑھے لکھے عوام کے علاوہ کسی کو انگریزی آتی نہیں۔ پھر میں نے خود سے اندازہ لگایا کہ جن سے میں نے پتہ پوچھا تھا ان کو انگریزی نہیں آتی ہوگی جس وجہ سے انھوں نے سر ہلا دیا تھا یہاں پر تو منٹ گزرتے ایسے لگ رہا تھا جیسے ہمیں یہاں ایرپورٹ پر خراب ہوتے گھنٹے گزر گئے ہوں میں نے کاونٹر پر جا کر راستہ پوچھا تو انھوں نے بڑی آسانی سے ہمیں باہر جانے کا راستہ نا صرف بتایا بلکہ خود ہمیں ٹیکسی سٹینڈ تک چھوڑ کر آئے میں نے ٹیکسی کاونٹر سے کلنگ جانے کا کرایہ پوچھا تو کاونٹر پر موجود نمائندے نے مجھے ملائی میں کچھ کہا جب مجھے اس کی کوئی بات پلے نہ پڑی تو اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہاں پر میرے ذہن میں ایک دم خیال آیا کہ محمود صاحب نے مجھے اپنے بیٹے کا نمبر اور ایڈریس فون پر سینڈ کیا ہوا ہے کیوں نہ میں ان کی بات ٹیکسی کاونٹر پر کروا دوں مگر ایسا کرنے کے لئے مجھے لوکل سم درکار تھی جو کہ اس وقت میرے پاس موجود نہ تھی سم لینے کی غرض سے میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں باہر سے سم مل جائے گی مگر نہ مل سکی اب کیونکہ میں یہاں کے ماحول سے ابھی واقف نہ تھا اس لئے میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ میں اپنی بیگم کو اکیلی سامان کے پاس کیسے چھوڑ کر جاؤں بحر حال میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا میں نے اپنی بیگم کو سمجھایا کہ مجھے سم لینے ہال کے اندر جانا ہے لہذا آپ یہاں سامان کے پاس کھڑی ہوں اور یہ خیال رکھنا کہ کوئی بھی آئے ساتھ جانے کا، یا۔ سامان لے جانے کا کہے تو کسی کے ساتھ جانے یا سامان لے کر جانے کی ضرورت نہیں میں ابھی واپس آ رہا ہوں۔ میں بیگم کو ٹیکسی سٹینڈ پر چھوڑ کر ہال میں چلا گیا اور اندر سے ایک فون اور فون سم لگے ہوئے کاونٹر سے سم مانگی تو کاونٹر پر کھڑے سیل مین نے مجھے کہا کہ اگر آپ نے سادہ سم لینی ہے تو 30 رینگرڈ کی اور اگر نٹ والی لینی ہے تو وہ 40 رینگرڈ کی ملے گی میں نے ایک منٹ کی خاموشی کے بعد انٹرنٹ والی سم خرید لی سم ہمارے وہاں پر کھڑے کوئی 20 سے 25 منٹوں میں چالو ہو گئی تو باہر ٹیکسی کاونٹر پر جا کر میں نے محمود صاحب کے بیٹے کے نمبر پر کال ملا کر ٹیکسی کاونٹر والوں سے بات کروا دی۔ بات کروانے پر محمود صاحب کے

بیٹے وقاص نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایڈریس بھی سمجھا دیا اور کرایہ بھی طے کر دیا اور مجھے فون پر بتا دیا کہ انکل آپ ڈرائیور کو 150 رینگٹ دے دینا یہ آپ کو ہمارے دیئے گئے ایڈریس پر پہنچا دے گا آپ بالکل بے فکر ہو کر بیٹھ جائیں کوئی مسئلہ نہیں ہے یہاں سے ہمارا گھر کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔جس پر میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کا نام نوٹ کیا اور پھر ٹیکسی کا نمبر بھی۔ ڈرائیور نے ہمارا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھا میں اور میری بیگم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہی مجھ سے پوچھا کہ سر چلیں میں نے اسے کہا کہ ٹھیک ہے اس نے گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہی مجھ سے سوال کر ڈالا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں میں نے اسے بڑے فخر سے جواب دیا پاکستان سے بھلا یہ جواب میں کیسے نہ دیتا پاکستان ہی تو ہمارا فخر ہے اور اس پر ہمیں ناز ہے جیسے جیسے ہم سفر میں آگے بڑھ رہے تھے مجھے اپنے ملک کا سارا وہ پہاڑی منظر یاد آ رہا تھا وہ کاغان ناران کے پہاڑی سلسلے وہ گلگت اور سکردو کے بلند و بالا پہاڑ وہ سارے منظر جو سوات اور ملم جبا کے ندی نالوں اور اس کی خوبصورتی کا منہ بولتا ثبوت ہے مجھے وہ سارے منظر ایسے ہی لگے جیسے میں اپنے ہی پیارے ملک پاکستان کی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر بل کھاتا پھر رہا ہوں فرق صرف اتنا کہ وہاں کی سڑکیں اپنے خوبصورت ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔روڈ کی دونوں جانب پام کے درخت ہر طرف سبزہ ہی سبزہ آنکھوں کی بینائی کو تروتازگی دے رہا تھا ان خوبصورت اور حسین نظاروں کو دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا میں اس خوبصورتی کا ذکر بار بار اپنی بیگم سے کرتا کہ دیکھو خدا کی قدرت کہ اس نے کیا کیا دل کش نظارے انسان کے لئے بنا رکھے ہیں ہمارے ہاں تو موٹر وئے پر جاتے کہیں نا کہیں خشک پہاڑیوں کا سلسلہ آ جاتا ہے مگر کوالالمپور کا سارا راستہ سبزے سے بھرا پڑا ہے حد نگاہ تک پام ہی کے درخت دکھائی دیتے ہیں اندر کا حال تو میں نہیں جانتا کیونکہ میں یہ سارا نظارہ ٹیکسی کے اندر ہی سے کر رہا تھا مگر جو کچھ سفر کے دوران ہم نے چلتے چلتے دیکھا ہے وہ صفائی اور دکھائی کے حساب سے قابل دید ہے۔ان تمام خوبصورت مناظر کو دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ان مناظر کو نہ صرف تصاویر کے ذریعے کیمرے کی آنکھ میں بند کر لیا بلکہ ان کے کہیں کہیں سے ویڈیو کلپس بھی بنا ڈالے ان مناظر میں ہم دونوں ہمسفروں کے گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ویڈیوز اور تصاویر بھی شامل ہیں۔یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور حبیب احمد اتنا جوکلی پرسن تھا کہ اس نے ہمیں پورے راستے میں اپنی خوش گفتار گفتگو اور لطیفوں کی وجہ سے کہیں اجنبیت یا بوریت کا احساس تک ہونے نہیں دیا مگر اگر یہ حادثہ ہو جاتا تو ہمارے سفر کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا ہوا یوں کہ جب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے کوئی 2 کلومیٹر کے فاصلے پر آگے موڑ آتا ہے جہاں پر ایک بہت بڑا سائین بورڈ آویزاں ہے جس پر لکھا ہوا ہے kamuning .persimpangam.kebun 504 کلومیٹر وہاں پر ایک بڑا ٹرالا ہمارے آگے جا رہا تھا اور اس کے آگے ایک کار بھی جا رہی تھی کہ اگلی کار والے نے اچانک اپنی کار کو جھٹکے سے روکنا چاہا تو ٹرالے والے نے اسے بڑی مشکل سے بچا لیا مگر کیونکہ ہماری گاڑی اس کے پیچھے تھی اور ہمارا ڈرائیور بڑی ہوشیاری کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا ہمیں اس وقت معلوم ہوا جب ہماری گاڑی کی ایمرجنسی باریک لگانے سے چیخیں نکلنا شروع ہوئیں تو ہماری تو جان نکل گئی اور ہم دونوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے تھے خیر مجھے تو شوگر کی وجہ سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے سڑک موٹر وئے ہونے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی تیز تھی جس پر ڈرائیور نے گاڑی کو تو اس بڑے حادثے سے بچا لیا تھا مگر ہماری حالت بہت بری ہو گئی تھی میں نے ڈرائیور سے کہا کہ خدا کا شکر ادا کریں کہ خدا نے ہمیں اس بہت بڑے نقصان سے بچا لیا ہے اور اس میں خدا کے بعد آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ آپ گاڑی کو ہوشیاری کے ساتھ چلا رہے تھے اس میں ٹرالے والے کا کوئی قصور نہیں چلو چلتے ہیں یہاں سے کوئی 10 سے 15 منٹ رکنے کے بعد ہم مزید اپنی منزل کی طرف چل دیئے جب ہم نے دوبارہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا تو اس سے پہلے کہ ڈرائیور حبیب مجھ سے کوئی مزید سوال کرتا میں نے اس سے پوچھ لیا کہ کیا یہ ٹیکسی آپ کی اپنی ہے یا آپ صرف ملازمت کرتے ہیں اس نے جواب دیا میں ملازم ضرور ہوں یہ گاڑیاں ہمیں SPAD کمپنی کی طرف سے دی گئی ہیں ہمیں کمپنی تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی دیتی ہے اور اس کے علاوہ ہمیں insentive ہے کہ جونہی ہمارے 60 سال مکمل ہوں گے یہ گاڑی ہماری ذاتی ہو جائے گی ہمارے ہاں تو چند سالوں سے یہ کام شروع ہوا ہے جبکہ ملائیشیا میں ایک عرصہ سے سہولت عوام کے لئے موجود ہے کہ اگر آپ کو کہیں بھی جانے کے لئے کمپنی کی ٹیکسی چاہیے تو آپ گھر بیٹھے SPAD کمپنی کے دیئے گئے نمبر پر فون کر دیں گاڑی آپ کے دروازے کے باہر پانچ سے دس منٹ کے اندر انتظار کر رہی ہو گی۔باتوں باتوں میں کوئی گھنٹے کا سفر پتہ نہ چل سکا جب ڈرائیور

نے وقاص کے نمبر پر فون کر کے پوچھا کہ جناب ہم آپ کے گھر سے تھوڑی دور ایک ٹیکنیکل سکول ہے جہاں پر ہم کھڑے ہیں ہمیں تھوڑا سا گائیڈ کر دیں انھوں نے کہا آپ اگلے چوک سے دائیں جانب مڑیں گے تو سامنے TAMILLY PADANA آپارٹمنٹس ہیں وہاں آجائیں ٹھیک پانچ منٹ میں ڈرائیور نے B 6 کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی جہاں پر محمود صاحب کا بیٹا حمیر کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا ہماری گاڑی دیکھتے ہی اس نے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا گاڑی رکی تو حمیر نے بڑے استقبالیہ انداز میں گاڑی کا دروازہ کھولا اور ہم جونہی گاڑی سے باہر نکلے تو ہم نے اسے پہچانتے ہوئے یہ ضرور سمجھ لیا کہ یہ محمود صاحب کا بڑا بیٹا ہو گا ہم نے بھی بڑی گرمجوشی کے ساتھ اسے گلے لگایا پیار کیا تو حمیر نے ہمارا سامان گاڑی سے نکالا اور ہم نے ڈرائیور کو کمپنی کے طے کردہ کرایہ کے مطابق سے 120 رینگرڈ دیئے جبکہ 5 رینگرڈ مزید ٹپ کے بھی دیئے ہم حمیر کے ساتھ سامان لے کر آپارٹمنٹ کی لفٹ کی جانب چل دیئے لفٹ تک پہنچتے ہی حمیر کے لفٹ کا بٹن پش کرنے سے لفٹ گرونڈ فلور پر آ کر رک گئی سامان رکھتے ہی حمیر نے 6th فلور پر لگا دی اور آنکھ جھپکتے ہی ہم اس منزل مقصود پر کھڑے تھے جہاں پر دروازے ہی میں محمود صاحب ان کی اہلیہ میڈم شازیہ ہمارے استقبال کے لئے کھڑے تھے گھر کے اندر داخل ہوئے تو ان کے بیٹے وقاص محمود، عدنان محمود، عبید محمود اور ہمیں نیچے سے اوپر لے کر آنے والا حمیر بھی ہمارے انتظار میں کھڑے تھے سب کے ساتھ بڑی خوش اسلوبی سے ملے اور ملنے کے بعد کیونکہ سب کے ساتھ ابھی زیادہ پر تکلفی نہ تھی اس لئے کچھ دیر ہم سب خاموش بیٹھے رہے اور محمود صاحب کی اہلیہ( اور پورے گھر کی مالکہ ) ناشتہ بنانے میں لگی رہیں تقریبا 11 بجے دن جب ناشتہ ٹیبل پر لگایا گیا تو ہمارے ساتھ پورے خاندان نے ناشتہ کیا اس دوران ہماری بہو رانی اور محمود صاحب کی صاحبزادی مہک عمر۔ عمر اقبال بھٹی۔ اقبال بھٹی۔ ان کی اہلیہ اور باقی پورے خاندان کا ذکر خیر ہوتا رہا خاص کر مہک کی بہت سی باتوں اور یادوں کا ذکر ہونے پر تو سارا گھرانہ ایک زوردار قہقے کے ساتھ ہنس پڑتا جب تک ہم ناشتے کی ٹیبل پر رہے ذکر خیر مہک اور عمر کا ہی رہا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں کہا گیا کہ آپ لوگ لمبے سفر سے آئے ہو اس لئے تھوڑا آرام کر لیں بس یوں دیکھ لیں دوپہر کے 2 بجے تک کا ٹائم گزرتے پتہ نہ چل سکا 2.30 پر محمود صاحب کے گھر پر کسی گورے اور اس کی ٹیم کے ساتھ فلاحی کاموں سے متعلقہ میٹینگ تھی ٹھیک 3 بجے بعد از دوپہر مسٹر سائمن اور ان کی اہلیہ، مسٹر فیاض اور ان کی اہلیہ، انگلیڈ سے تعلق رکھنے والے مسٹر ٹم اور مسز ٹم کی سربراہی میں تشریف لے آئے اس میٹینگ کے دوران میرا تمام حاضرین سے تعارف کروایا گیا جس پر مسٹر اینڈ مسز ٹم جو کہ انگلینڈ سے ایشیاء میں فلاحی کاموں کی غرض سے پچھلے 25 سال سے کام کر رہے ہیں انھوں نے 25 میں سے 20 سال پاکستان میں کام کیا ہے یہی وجہ ہے کہ مسٹر اینڈ مسز ٹم بڑی عمدہ قسم کی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں جب انھوں نے سنا کہ میں یونس وریام اس وقت پاکستان سے آئے ہوئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے انھوں نے خوشی کے ساتھ ہمارے ساتھ تصاویر بھی بنوائیں۔ جبکہ مسٹر سائمن لاہور چھاونی کے نکلے جو کہ سینٹ جوزف ہائی سکول کے پڑھے اور مجھ سے کوئی چار کلاسز سینئر ہیں انھیں مل کر تو اور زیادہ خوشی ہوئی۔ انھوں نے اور ان کی مسز نے تو مجھے اور میری بیگم کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے دی مگر وقت نے میرا ساتھ نہ دیا اور میں ان کے ہاں نہ جا سکا۔ اب کیونکہ میں ملک پاکستان ہی سے lankawi اور اس کے اردگرد کے مقامات کی سیر و تفریح کا پروگرام بنا کر یہاں آیا تھا جب سارے لوگ میٹینگ ختم ہونے کے بعد جا چکے۔ تو میں نے محمود صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ سوموار کو ہم نے Lunkawi جانا ہے کیا آپ کبھی گئے ہیں تو انھوں نے کہا ابھی تک ہم نہیں جا سکے یہاں پر پاسٹر روبن صاحب ہیں وہ جا چکے ہیں ان کے ساتھ پروگرام بنا لیتے ہیں انھوں نے اپنے بیٹے وقاص سے کہا کہ روبن صاحب کو فون کر کے بلائیں ان سے پوچھتے ہیں فون کرنے پر روبن صاحب نے اتوار کے روز 4.45 بعد از سپہر آنے کا وعدہ کیا اور ہم ان کے وعدہ کے مطابق آرام سے بیٹھ گئے شام ہوئی تو فلیٹوں کے احاطہ میں بنائے گئے پارک میں ہم سیر کرنے کی غرض سے چلے گئے جب پارک میں پہنچے تو ہم سے پہلے بہت ساری بوڑھی خواتین اور عمر رسیدہ بزرگ بھی سیر اور ورزش کرنے میں مصروف تھے راقم الحرف اور محمود صاحب پارک کے چکر لگاتے اور حالات حاضرہ کی باتیں کرتے رہے میں انھیں اس بات پر آمادہ کرتا رہا کہ کیونکہ آپ لوگوں نے پہلے Lunkawi نہیں دیکھا میں نے سنا ہے کہ یہ جزیرہ ملائیشیاء کا سب سے خوبصورت جزیرہ ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ لوگ بھی فیملی کے ساتھ ہمارا ساتھ ضرور دیں پہلے تو مجھے وہ کہتے رہے ٹھیک ہے پروگرام بنا لیتے ہیں ہفتے کی ساری رات میں نے محمود صاحب اور ان کی اہلیہ کے علاوہ ان کے بچوں کو اس بات پر آمادہ کیا جب رات

کے 2.00 بج گئے تو فیصلہ یہ ہوا کہ صبح سنڈے ہے اور 11.00 بجے چرچ سروس کے لئے جانا ہے اس کے بعد روبن صاحب بھی یہاں آ جائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ یہ پروگرام بنالیں گے محمود صاحب کی مسزنے ایک دم سوال کیا کہ بھائی جان کیا آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ چرچ سروس کے لئے جائیں گے میں نے فوراً کہہ دیا کہ کیوں نہیں اس پر وقاص نے صبح کا سارا سیڈول بتاتے ہوئے کہا کہ صبح بڑے چرچ میں 11.00 بجے انگلش عبادت ہوگی جو 1.00 بجے تک جاری رہے گی اس لئے ہم صبح 10.30 پر یہاں سے جائیں گے اور ناشتہ ہم واپس آکر کریں گے اس طرح میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے 2.45 پر رات چلا گیا باقی لوگ پہلے ہی سو چکے تھے۔

میں کمرے میں تو چلا گیا مگر نیند کہاں آتی ہے بستر پر تکیے کے نیچے رکھا فون اٹھایا اور امریکہ میں مقیم کیلب فقیر سے فون پر پرانی دوستی کی کچھ یادیں دھراتے دھراتے صبح کے 5.00 بج گئے اور پھر نا جانے کب نیند آگئی ۔

اتوار کی صبح اور Klang Mathodist church رات لیٹ یعنی اتوار کی صبح کوئی 6.00 بجے تک جاگنے کے باوجود صبح کا آغاز جب 9.00 بجے میرے جاگنے سے ہوا تو میری جیون ساتھی اور تمام گھر والے جاگ چکے تھے جب میں نے باتھ روم کی طرف دیکھا تو وقاص باتھ روم میں جا چکا تھا میں نے شوگر کی گولی لے لی۔ میں نے گولی لینے کے فوراً بعد اپنے سوٹ کیس سے کالے رنگ کی سرٹ ٹائی اور گرے رنگ کی پینٹ لیتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھا کہ یہاں پر استری کا کوئی بندوبست ہے کیونکہ پہلا دن تھا انھوں نے مجھے جواب دیا دیکھی نہیں چنانچہ کیونکہ گھر سے استری کر کے کپڑے رکھے تھے اس لئے بغیر استری کئے باتھ روم نہانے کی غرض سے چلا گیا اب کیونکہ سیوٹی کپڑوں میں ڈھونڈنے کے باوجود نہ ملی تھی اور میں واش روم جا چکا تھا غسل کرنے کے بعد ادھر ادھر واش روم میں سیوٹی دیکھتا رہا تھوڑی نظر گھومائی تو ایک کونے میں پڑی سیفٹی ریز نظر آگئی اور میں نے بغیر سوچے سمجھے اسی سے سیو کر ڈالی اب کیونکہ سیو کرنا میرا روز کا معمول بنا ہوا تھا اس لئے میری مجبوری تھی کہ جو بھی اس وقت دستیاب سیفٹی ریز تھی اسی سے سیو کر لیتا جونہی میں تیار ہو کر باتھ روم سے باہر آیا تو مسز محمود نے کہا کہ بھائی جان ناشتہ تیار ہے آپ لوگ ناشتہ کر کے جایئے گا کیونکہ چرچ ختم ہونے پر لوگوں سے ملتے ملاتے تقریباً سہ پہر کے 3.00 بج جاتے ہیں میں نے پاسٹر صاحب سے پوچھا کہ پاسٹر صاحب چرچ کا اصل ٹائم کیا ہے تو انھوں نے کہا اس وقت 9.45 ہوئے ہیں اور 10.30 پر چرچ شروع ہو جاتا ہے میں نے پوچھا پاسٹر صاحب چرچ کتنے فاصلے پر ہے تو انھوں نے کہا کہ اگر پیدل جائیں تو دس سے پندرہ منٹ لگتے ہیں ہم نے سوچا کہ ابھی ٹائم ہے چلو ناشتہ کر ہی لیتے ہیں 10 سے 15 منٹ میں ہم نے ناشتہ کر لیا فوراً نیچے گئے اور پرائیویٹ ٹیکسی نے ہمیں 3.00 رینگرڈز میں وقت سے پہلے نزدیک ہی پانچ منٹ کی مسافت پر پہنچا دیا عبادت مذہبی KLANG MATHODES CHURCH DEWAN GRACE CENTER چرچ پہنچا دیا عبادت سنگیت سے شروع ہوئی کوائر کی لڑکیوں اور لڑکوں جن میں انڈین، چائنیز، برمی، نیپالی، اور لوکل ملائی کرسچن موجود تھے جنہوں نے بڑے روح پرور روح القدس کے حوالے سے گیت پیش کئے اور عبادت کے ماحول کو بہت سنجیدہ بنا دیا جب کہ چائنیز پاسٹر ریچرڈ paster Rechard نے روح القدس پر بائبل مقدس کی روشنی میں روحانیت سے بھرپور گفتگو کی جیسے مومنین نے بہت پسند کیا آج کیونکہ اتوار کی خاص عبادت تھی اور پورا حال مومنین سے بھرا پڑا تھا کھڑے ہونے کی جگہ تک نہ ملتی تھی جونہی 1.45 دوپہر عبادت اپنے اختتام کو پہنچی تو آسٹریلین اور چائنیز پاسٹرز صاحبان سے مومنین کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے مسائل کے حل کے لئے دعا کروانے سٹیج تک پہنچ گئی جس پر پاسٹرز صاحبان نے فرداً فرداً ہاتھ رکھ کر دعائے خیر کی دعا کروانے والوں میں سے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو دوسرے ممالک سے بھاگ کر یو این او کے بینر کے نیچے پناہ گیزیں ہو چکے تھے اور اپنے آبائی ممالک میں جانے کے لئے تیار نہیں بلکہ یورپی ممالک میں آبادکاری کے لئے تیار بیٹھے ہیں مجھے یہ ساری صورت حال دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ملائیشیاء میں مسیحی مبلغین زور پکڑ رہے ہیں اور مسیحیت تیزی سے پھیل رہی ہے یہاں پر میری ملاقات بہت سارے ایسے پاکستانی مسیحیوں سے بھی ہوئی جنہوں نے پاکستان سے آکر ملائیشیاء یو این او کے ادارے میں کیس دائر کر رکھے ہیں اور یہاں پر کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ملائیشیاء میں مقیم ہر پاکستانی نے ملاقات کے دوران اپنا اپنا دکھ سنا ڈالا یہاں تک کہ بعض مرد وخواتین جن میں جوان اور بوڑھے بھی شامل تھے نے اپنی درد کہانی سناتے ہوئے ڈھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ گو کہ میری بھی اس وقت آنکھیں اشک بار ہو رہی تھیں مگر اس غم کی گھڑی میں میں ان پاکستانی بہنوں بھائیوں اور بزرگوں کو تسلی کے علاوہ کچھ نہ دے

۔کااس وقت بہت سارے لوگوں نے میرے ساتھ تصاویر بنوانے میں فخر محسوس کرتے ہوئے تصاویر بھی بنوائیں بعد ازاں پاسٹر محمود صاحب نے ہمیں ایک ایسے سکول کا وزٹ بھی کروایا جو یو این او کی سرپرستی میں چلتا ہے اور یہاں پر وہ لوگ جو دوسرے ممالک سے ملائیشیاء میں پناہ گزین ہیں ان کے بچے زیر تعلیم ہیں یہاں پر ہر قسم کی ٹیکنیکل تعلیم سے لے کر سلیبس کی بین الاقوامی لیول کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سکول کو پاسٹر محمود سپروائز کرتے ہیں۔گھر واپسی پر ہم مارکیٹ سپیدل ہوتے ہوئے 15.20 منٹ میں پہنچ گئے ہمارے گھر پہنچتے ہی مسز محمود صاحبہ نے دوپہر کا کھانا تیار کر رکھا تھا جاتے ہی انھوں نے کھانا لگا دیا مسٹر روبن صاحب کا بھی انتظار تھا کیونکہ انھوں نے بھی LUNKAWI جانے کے لئے ہمارے ساتھ پروگرام طے کرنے آنا تھا کھانا کھاتے ہوئے ہمیں کوئی 3.45 سپہر ہو چکے تھے کھانا کھانے کے بعد ہم اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ روبن صاحب آئیں گے اور چائے ان کے ساتھ لیں گے انتظار کرتے کرتے پہلے 4 بجے تو وقت ضائع کرنے کی بجائے محمود صاحب نے مسٹر شیرو کو اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کیلئے بلا بھیجا ہم گاڑی میں بیٹھ کر کافی پینے کافی شاپ جہاں پر بار بھی موجود تھی اور جوان لڑکے اور لڑکیاں کافی، بیر سافٹ اور ہارڈ ڈرنک لے رہے تھے اور کمپیوٹر پر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے حمیر محمود جو کہ اسی شاپ پر منیجر کے طور پر کام کرتا ہے ہمارے پاس آئے اور ہم سے پوچھا کہ سر آپ کیا لیں گے میں نے تو انھیں کہہ دیا کہ مجھے بلیک کافی دے دو جس پر مسٹر حمیر نے کہا کہ سر یہ تو بہت کڑوی ہوتی ہے کیا آپ نے پہلے کبھی استعمال کی ہے میں نے کہا بہت مرتبہ۔اس نے کہا کہ آج آپ کو ایک نئی نسل کی کافی پلاتے ہیں میں نے کہا ٹھیک جیسے آپ کی مرضی حمیر نے ہم سب کے لئے کافی کا آرڈر لگا دیا جب کافی پی،تو کافی کا واقع ہی ایک الگ سا ٹیسٹ تھا کافی شاپ سے جب فارغ ہوئے تو سامنے کچھ فاصلے پر JESCO SHOPING MALL میں چلے گئے اس 6 منزلہ شاپنگ مال کا ہر فلور ہم نے دیکھا جو کہ قیمتوں کے اعتبار سے بڑا موزوں تھا اور جہاں پر سیل لگی ہوئی تھی اس کا تو کیا ہی مزہ تھا مگر گارمنٹس اور بہت سی الیکٹرونک مصنوعات سیل کے باوجود پاکستانی قیمتوں سے کہیں زیادہ تھیں اسی وجہ سے میں نے اس مال سے کوئی خرید وفروخت نہ کی مگر کچھ تصاویر بناتے ہوئے جب دوبارہ پہلے فلور پر آئے تو ایک مسلم لڑکے لڑکیوں کا INTAN DANCE GROUP گروپ ثقافتی ڈانس پیش کر رہا تھا اور اس گروپ کو میڈم آسیہ لیڈ کر رہی تھیں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ شو خاص موقعوں پر مال میں خرید وفروخت کرنے والے آئے ہوئے عوام کو انٹرٹینمنٹ کے لئے ہوتے رہتے ہیں اس موقعہ پر شو پیش کرنے والی لڑکیاں اور لڑکے عوام کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں تھک ہار کر جب 6 بجے ہم گھر پہنچے تو روبن صاحب ابھی تک نہ پہنچے تھے مگر اسی دوران وکٹر ڈائنیل، آصف عمران، اور ڈاکٹر عادل امین سے جب میری فون پر بات ہوئی تو انھوں نے مجھے فون پر ہی ایف جی اے بائبل کالج میں منعقد ہونے والے مشاعرہ کی دعوت دے دی جس پر میں نے انھیں بتایا کہ میری مجبوری ہے کیونکہ میں اس وقت ملک سے باہر اپنی کتاب چن سورج تے تارے کی رونمائی کے سلسلے میں آیا ہوا ہوں اس وجہ سے میں ذاتی طور اس مشاعرے میں شرکت نہ کر سکوں گا بحر حال آپ کی دعوت کا شکریہ۔روبن صاحب کے نہ آنے کی وجہ سے ہم امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر بیٹھ گئے میں ذاتی طور پر بڑا مایوس ہوا کہ آج کا سارا دن روبن صاحب کے انتظار میں نکل گیا ہے اور صبح ہم نے ہر صورت LUNKAWI کے لئے روانہ ہونا ہے میں نے محمود صاحب سے کہنا شروع کر دیا کہ آپ روبن صاحب کو چھوڑیں ہم اپنی فیملی چلتے ہیں میرے اسرار کے بعد کوئی 8.00 بجے رات محمود صاحب نے مجھے کہا کہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم یہاں سے یو۔این۔او۔کے حکم کے مطابق بائی روڈ تو سفر کر سکتے ہیں مگر بائی ایر نہیں ان کی اس بات پر میں نا صرف حیران بلکہ پریشان بھی ہوا کہ یہ کیا بات ہوئی جانا تو ایک ہی ملک میں ہے کسی دوسرے میں تو نہیں وہ چاہئے بائی روڈ ہو یا بائی ایر میں نے سوچا کہ شائد محمود صاحب جہاز کے خرچے کی وجہ سے یہ بہانہ لگا رہے ہیں اور میں نے ان کے اس بہانے کو ختم کرنے کے لئے محمود صاحب سے کہا کہ آپ لوگ جہاز کی ٹکٹس کا مت سوچیں ان کا بندوبست میں کر لوں گا بس آپ لوگ تیاری کریں 9.30 پر رات روبن صاحب کا فون آ گیا کہ میں صبح 11.00 بجے دن آؤں گا اور LUNKAWI کا پروگرام بنائیں گے اور ہم دوبارہ سے خاندانی دعا کرنے کے بعد 1.00 رات اپنے کمرے میں اسی کشمکش میں سونے کے لئے چلے گئے کہ دیکھیں صبح اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ان حالات میں بھلا نیند کس کو آتی ہے کچھ اپنے دوستوں جن میں یوسف پرواز، وکٹر ڈائنیل، جاوید ڈینی ایل، کیلب فقیر شامل ہیں کے ساتھ فون پر بات کرتے کرتے نا جانے کب نیند آ گئی۔

(سفر نامہ ”گڈ بائے لنکاوی سے)

# ارجنٹائن-خوابوں جیسی حسین سرزمین

عامر بن علی/لاہور

بیونس آئرس ائیر پورٹ پر جہاز لینڈ ہوتے ہی بیشتر مسافروں نے تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ دنیا کے دیگر خطوں کے مقابلے میں لاطینی امریکہ کے باسی زیادہ جذباتی اور جذبات کے اظہار میں ذرا زیادہ دلیر اور آزاد واقع ہوئے ہیں۔ ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ارجنٹائن کا یہ سب سے بڑا شہر ہے اور اس ملک کا دارالحکومت بھی ہے۔ ہمارے اسلام آباد اور انڈیا کے دہلی کی طرح بیونس آئیرس بھی ایک خود مختار علاقہ ہے اور کسی صوبے کا حصہ نہیں ہے۔

گو کہ ارجنٹائن کے 23 صوبے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ اس ملک کو دنیا کی رقبے کے اعتبار سے آٹھویں بڑی مملکت بناتا ہے۔ علاوہ ازیں رقبے کے لحاظ سے یہ ہسپانوی بولنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

ارجنٹائن پہنچ کر پہلی خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب ہوٹل کے استقبالیہ پر کھڑے نوجوان لڑکے نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی کہا کہ آپ کی بیشا شفیع مجھے بے حد پسند ہے، کیا خوبصورت آواز میں گاتی ہے۔ حیرت کا پہلو یہ ہے کہ اس نوجوان کو سوائے ہسپانوی کے کوئی دوسری زبان نہیں آتی، اردو تو بالکل بھی نہیں۔ مگر موسیقی تو ایک عالمی زبان ہے، بول سمجھ میں نہ بھی آسکیں پھر بھی آپ لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سات سمندر پار بیٹھا یہ شخص پاکستان کے کوک سٹوڈیو میں ریکارڈ ہونے والے سیزن 9 تک ہماری موسیقی پر کان جمائے بیٹھا ہے۔ فن سے یہ لوگ پیار کرتے ہیں ۔ اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ان لوگوں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں تھیٹر میں نے دنیا کے کسی اور دیس میں نہیں دیکھے۔ حالانکہ داخلے کی سب سے سستی ٹکٹ بھی پاکستانی سات ہزار روپے کی ہے، جبکہ مہنگی تو کافی زیادہ مہنگی ہے۔ شہر کے وسط میں حکومت کا قائم کردہ تھیٹر میوزیم بھی

قابلِ دید ہے۔ اس میں تھیٹر کی روایت اور تاریخ کا احاطہ کرنے کے علاوہ عہد ساز ڈراموں کی تصاویر اور ملبوسات سجائے گئے ہیں۔ یہ میوزیم ایک قدیم و معروف تھیٹر کی عمارت میں

قائم کیا گیا ہے۔ شہر میں دن بھر کسی نہ کسی چوک اور چوراہے ہیں ''تانگو'' رقص ہوتا رہتا ہے، جو کہ ارجنٹائن کی ثقافتی پہچان ہے۔ بن سنور کر لڑکے لڑکیاں اس میں شریک ہوتے ہیں، بہت سارے ان میں سے پروفیشنل اور نیم پروفیشنل بھی ہوتے ہیں، مجمع اکٹھا کر کے یہ تانگو رقص پیش کرنے کے بعد اپنی موسیقی کی بنائی ہوئی سی ڈی فروخت کرتے ہیں۔ اس کی قیمت عموماً کافی یا چائے کے ایک کپ کے برابر ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جیسے مداری اور مجمع باز تماشہ دکھا کر پہلے مجمع اکٹھا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی دوائی بیچتے ہیں۔ شاید یہی رنگا رنگی ہی وجہ ہے کہ بیونس آئرس جنوبی امریکہ میں سیاحوں کی مقبول ترین منزل اور سب سے زیادہ سیاحتی آمدورفت والا شہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس شہر میں امن وامان کی صورت حال مثالی ہے اور پھر سمندر کے ساحل نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مقامی کرنسی پیسو ہے ایک پیسو ہمارے سات روپے کے برابر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سالہا سال تک ارجنٹائن نے ڈالر اور پیسو کو آپس میں یوں نتھی کیا ہوا تھا کہ ایک پیسو، ایک امریکی ڈالر کے برابر تھا۔ مگر چونکہ یہ تعلق مصنوعی طریقے سے جوڑا گیا تھا، اس فیصلے کی معاشی بنیادیں کمزور تھیں۔ لہذا یہ تعلق جب ٹوٹا تو اس کے انجام کے طور پر ارجنٹائن کو بہت خوفناک معاشی بحران سے گزرنا پڑا۔ پیسو کو آزاد کرنسی قرار دے دیا گیا، بعد از خرابی بسیار، آجکل ایک ڈالر میں پندرہ پیسو آجاتے ہیں۔ ارجنٹائن کی معیشت کو اگر تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو صرف ایک صدی پہلے یہ دنیا کا ساتواں امیر ترین ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کی معاشی ترقی ہی وہ وجہ تھی کہ یہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یورپ سے ہجرت کرنے والے تارکین وطن کی امریکہ کے بعد سب سے مقبول منزل تھا۔ یہ تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ اس ملک کی ستر (70%) فیصد آبادی ہسپانوی اور اطالوی نسل کے لوگوں کی ہے باقی ماندہ لوگ یورپ کے دیگر ممالک یا پھر دنیا کے باقی ملکوں سے آئے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ امریکہ اور آسٹریلیا و کینیڈا کی طرح تارکین وطن کا ملک ہے۔ معیشت میں گراوٹ کے باوجود یہ معاشی اعتبار سے پہلے بیس، دنیا کی مضبوط ترین معیشت رکھنے والے ممالک میں سے ایک ہے۔

برف پوش اور سرسبز پہاڑوں، ہری بھری چراگاہوں اور میدانوں کے اس دیس کی مرغوب غذا گوشت ہے۔ یہاں اعلیٰ قسم کا تازہ گوشت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے اور یہ گوشت اس ملک کی برآمدات کا اہم جزو بھی ہے۔ بھنا ہوا گوشت یہاں کی زندگی اور دسترخوان کا لازمی جزو ہے۔ تازہ سبزیاں، پھل اور دودھ کے علاوہ گوشت مرغوب و مقبول غذا ہے، اسی سبب سے لوگ بہت صحت مند ہیں۔ کھانے، پینے کے شوقین لوگ بہت ہیں مگر موٹاپا نہیں پایا جاتا۔ اس

کی وجہ عوام کی کھیلوں کے ساتھ رغبت ہے۔ یوں تو کبڈی سے لیکر ہاکی، ٹینس، گالف، سبھی کچھ یہاں اعلی معیار کا کھیلا جاتا ہے مگر فٹبال کی مقبولیت کا احوال تو بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک پورے اسٹیڈیم کو جو شہر کے وسط میں تھا، فٹبال کے عجائب گھر میں بدل دیا گیا ہے۔ داخلے کی ٹکٹ پانچ صد روپے ادا کر کے اندر جائیں تو دیکھیں گے کہ ارجنٹائن کے فٹ بال کی پوری تاریخ یہاں محفوظ ہے۔ سینما اسکرینیں لگی ہوئی ہیں، جن پر ہر وقت فٹ بال کے یادگار لمحوں کی فلمیں چلتی رہتی ہیں۔ میراڈونا کا گول یہ اب بھی نہیں بھولے جس نے انہیں دہائیاں قبل فٹ بال کا عالمی چیمپئن بنایا تھا۔ فٹبال میوزیم کے اردگرد ریستوران اور دوکانیں بھی فٹبال کے دیوانوں اور پروانوں کی ہیں۔ ایک ایسے ہی ریستوران میں لنچ کیلئے داخل ہوا تو پتا چلا کہ یہاں مشہور کلب کولوکولو کا قبضہ ہے۔ جان کی امان چاہتے ہیں تو ان مردوزن کے سامنے کولوکولو کے متعلق کوئی تنقیدی جملہ زبان پر مت لائیں بے حد جذباتی فضا اور مزیدار کھانا۔

ارجنٹائن کے سماج کا طائرانہ جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی سب سے مقبول شخصیات تین ہیں، جو کہ معروف فٹ بالر میراڈونا، بائیں بازو کے انقلابی گوریلا چے گویرا اور پاپائے روم فرانسس ہیں، ان تینوں کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ ویسے تو ہالینڈ کی موجودہ ملکہ معظمہ میکسیما بھی ارجنٹائن میں پیدا ہو کر یہیں پلی بڑھی ہیں مگر ان کی مقبولیت مذکورہ شخصیات جیسی نہیں ہے۔ پوپ فرانسس کی عالمی اہمیت تو اس وجہ سے بھی ہے چونکہ وہ پہلے غیر یورپی ہیں جو ویٹی کن میں اس بلند ترین عہدے تک پہنچے ہیں، کیتھولک کلیسا کے سربراہ کی اہمیت بالخصوص لاطینی امریکہ میں کچھ زیادہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کیتھولک یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک میں ان کا تناسب اسی فیصد (80%) کے قریب ہے۔ یوں تو ایونجلیکل عیسائی مسلک شمالی وجنوبی براعظم امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا عقیدہ ہے۔ مگر ابھی تک کسی بھی ملک میں اس کے پیروکار دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، ارجنٹائن میں ان کا تناسب نو فیصد ہے اور گیارہ فیصد لوگ لادین ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ یہاں بسنے والے یہودیوں کے برابر ہے یا پھر ان سے تھوڑے زیادہ ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان مسجد ہے جس سے ملحقہ ایک لائبریری اور اسلامک سنٹر بھی ہے۔ اس کا انتظام عرب مسلمان چلاتے ہیں۔ عالیشان مسجد کی ویرانی دیکھ کر اقبال کا وہ شعر یاد آتا ہے۔

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

لاطینی امریکہ میں سب سے زیادہ یہودی اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ دارالحکومت میں جگہ جگہ آپ کو مخصوص ٹوپی ''سکل کیپ'' سیاہ کوٹ پتلون اور سفید قمیض میں ملبوس یہودی نظر آتے ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک بڑا اور قدیم ''سینیگاگ'' ہے۔ اس معبد سے ملحقہ ایک یہودی میوزیم ہے۔ میں نے اس میوزیم میں داخل ہونے کی بہت کوشش کی مگر مسلمان اور پاکستانی شناخت ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ میری درخواست پر غور جاری ہے، انتظامیہ کا کہنا ہے کہ آپ کو ای میل کے ذریعے مطلع کر دیا جائے گا، صاف انکار انہوں نے ابھی نہیں کیا ہے۔

بیونس آئرس کے مرکز میں تمام عمارتیں کثیر المنزلہ ہیں۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے تو یہ یورپ کا کوئی شہر معلوم ہوتا ہے، ہسپانوی اور اطالوی طرز تعمیر نمایاں ہے۔ ہسپانوی طرز تعمیر کی وجہ بھی قابل فہم ہے کہ یہ ملک صدیوں تک سپین کی نو آبادی رہا ہے اور 1810 میں اس نے آزادی حاصل کی ہے۔ لاطینی امریکہ میں ارجنٹائن ہسپانوی نو آبادیاتی سلطنت کی اسی طرح وارث ریاست ہے جس طرح سوویت یونین کی وارث روس کی ریاست ہے۔ چونکہ لاطینی امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کا صدر مقام یہیں تھا۔ گنجان آباد اور جدید شہر ہونے کے باوجود بیونس آئرس میں ٹوکیو، نیویارک یا لندن جیسی بے چینی اور دوڑ دھوپ نظر نہیں آتی بلکہ ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور موسیقیت یہاں کا خاصہ ہے۔ جگہ جگہ رقص وموسیقی کا دور دورہ ہے۔ لوگوں کا عمومی معیار زندگی کافی بہتر ہے۔ ساحل سمندر کے ساتھ بنی سڑک پر وقفے وقفے سے ملک کے اہم کھلاڑیوں کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔ فٹ بال ٹینس، ہاکی، باکسنگ سے لے کر جمناسٹک اور دیگر کھیلوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے موجودہ اور سابق کھلاڑیوں کے مجسمے عوامی مقامات پر نصب کرنا ان کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ ساحل کے ساتھ اسی سڑک پر خواتین کے لئے مخصوص ایک ٹینس کلب کا نام پڑھ کر میں دیر تک اکیلا ہی ہنستا چلا گیا۔

آپ بھی سنیے کیا تخلیقی نام ہے ''ڈارلنگ ٹینس کلب''، یقیناً آپ کو بھی زنانہ ٹینس کلب کی تانیث بیان کرنے کے لیے یہ طریقہ پسند آئے گا۔ آپ کسی بھی وقت گھر سے نکلیں، ہر وقت تازہ دم ہواؤں کے جھونکے آپ سے ٹکرانے لگتے ہیں، مگر یہ ہوائیں

''صرصر'' نہیں بلکہ ''صبا'' کی سی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان ہواؤں سے متاثر ہو کر ہی اس شہر کا نام بیونس آئرس رکھا گیا یعنی ''خوش کن ہوائیں'' یا پھر ہسپانوی زبان سے اس کا ترجمہ ''بادِ خوش گوار'' بھی کیا جا سکتا ہے۔ سپین سے آنے والا وہ مہم جو یقیناً بہت باذوق ہو گا جس نے نیا شہر بسا کر پانچ صدیاں پہلے اس کو مدھر ہواؤں سے منسوب کر دیا۔ ان ''اچھی ہواؤں'' کا ہی فیض ہے کہ گنجان آباد اور کثیر المنزلہ ہونے کے باوجود دنیا کے دیگر میٹروپولیٹین شہروں کی طرح یہ کنکریٹ اور اسفالٹ کا جنگل نہیں لگتا بلکہ زندہ دلوں کا شہر معلوم پڑتا ہے۔

ارجنٹائن میں سڑکوں اور چوراہوں کے نام عموماً دوست ممالک اور ان کے شہروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ ملک کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ایام سے بھی

شاہراہوں کو منسوب کیا گیا ہے، جیسے 9 جولائی نام کی سڑک تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ ویسے یہ چلن ارجنٹائن تک ہی محدود نہیں بلکہ لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ گلی، کوچے، سڑکیں اہم شخصیات کے علاوہ اہم دنوں، دوست ممالک اور ان کے شہروں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ یہاں ''پاکستان چوک'' بھی ہے۔ سڑکوں کے کناروں پر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اور گلیوں، بازاروں میں

گھومتے پھرتے خواتین کی اتنی بڑی تعداد سگریٹ نوشی کرتے میں نے اسی عالم رنگ و بو میں اور کہیں نہیں دیکھی، جتنی کثیر تعداد اس دیس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میرا مطلب ہے عوامی مقامات پر اور وہ بھی آزادانہ چلتے چلتے مرد و زن کی کثیر تعداد تمبا کو نوشی میں محو نظر آتی ہے۔ اٹھائیس لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل یہ جنت نظیر ملک فقط رقبے کے اعتبار سے دنیا کا آٹھواں بڑا ملک نہیں ہے بلکہ اپنے حسن اور ثقافت کی بنیاد پر دنیا کا آٹھواں بڑا عجوبہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں کا معیاری وقت پاکستان سے آٹھ گھنٹے پیچھے ہے مگر جب یہاں پہنچیں تو لگتا ہے یہ دنیا ہی کوئی مختلف ہے۔ صرف یہاں کا موسم ہی ہم سے متضاد نہیں، یعنی دسمبر میں گرمی اور جون سخت سردی کا مہینہ ہے، بلکہ ہمارے اندازِ زیست اور ان کے زندگی گزارنے کے ڈھنگ میں بھی کھلا تضاد ہے۔

(سفر نامہ ''جہاں گردی'' سے)


ممتاز شاعر علی رضا کا

مرتب کردہ نعتیہ انتخاب

**درود اُن پر سلام اُن پر**

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

نستعلیق مطبوعات

3-فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور



نامور شاعر اور ادیب

**تفاخر محمود گوندل کی شہرہ آفاق کتب**

تقدیس (نعتیہ مجموعہ)، نکہتِ نور (نعتیہ مجموعہ)

تجلیاتِ رسالت ﷺ (سیرت طیبہ نثری کاوش)

جلوہ ہائے جمال (سفر نامہ حجاز)

معارف العباد (نثری کاوش)

گیسوئے برہم (غزلیات)

غمزۂ خوباں (نعت، غزلیات)

اقبالؒ اہل بیتؑ کے حضور (زیر طبع)

طلاقتِ لسانی (فن خطابت)



مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلہ

# الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

# شاعری

کتنے سپنے جگا کے رات گئی
جشن کیا کیا منا کے رات گئی
تاپتے جسم دن گزارا ہے
آگ کیسی لگا کے رات گئی
ہر طرف ہو رہے ہیں ہنگامے
کیسا فتنہ اُٹھا کے رات گئی
سر دُھنے جا رہا ہے ہر لمحہ
راگ کیسا سنا کے رات گئی
کٹ گیا دن بھی سوئے سوئے ہی
خواب کیسا دکھا کے رات گئی
مٹ گیا فرق رات اور دن کا
جانے کیا کیا منا کے رات گئی
روشنی دن کی بھی ہے ناکافی
جانے کیا کیا بجھا کے رات گئی
ہر کوئی لڑکھڑاتا پھرتا ہے
کون سی شے پلا کے رات گئی
ہو گیا دن بھی زخم زخم آخر
کیسے چرکے لگا کے رات گئی
مبتلا بھاگ دوڑ میں ہیں سبھی
کون سی رہ دکھا کے رات گئی
رنگ و خوشبو چمن سے غائب ہیں
کون سے گل کھلا کے رات گئی
کون دیکھے گا روسیاہ سحر
کیسا چہرہ دکھا کے رات گئی
رات رُوحی کہیں گئی نہ تھی
کون کہتا ہے آ کے رات گئی

رُوحی کنجاہی/لاہور

---

مجبور اس قدر ہوئے اپنی انا سے ہم
تجھ کو بھی مانگتے نہیں اب تو خدا سے ہم
اے دل ہمیں بھی اب رہِ شہرِ ہوس دکھا
مایوس لوٹ آئے ہیں دشتِ وفا سے ہم
آخر کسی تو رُت میں کُھلے اس کی کلی
صرصر سے روٹھ جائیں کہ بادِ صبا سے ہم
وہ دن چلے گئے وہ زمانے نہیں رہے
جب کانپ جایا کرتے تھے خوفِ خدا سے ہم
آؤ نبردِ عشق سے پہلے یہ سوچ لیں
زخم بدن چھپائیں گے کس کی قبا سے ہم
دریا بہا دیے کہیں صحرا بچھا دیے
واقف نہیں ہوئے تری طرزِ عطا سے ہم
اُس مہرباں کی یاد سہارا بنی رہی
افسردہ گر کبھی ہوئے نصرتؔ ذرا سے ہم

نصرت صدیقی/لاہور

---

لکھا ہوا ہے جہاں لاتفرقوا، راشدؔ
ہم اس کتاب کو فرقوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں
سچ کا حلف اُٹھا کر بھی وہ جو بولا
آدھا اُس میں سچ تھا، باقی آدھا جھوٹ
کچھ اصولی ہیں اور کچھ ذاتی
ہو نہ جائیں یہ نفرتیں گڈمڈ
اس میں ترا ہی تذکرہ آئے گا بار بار
تفصیل رائیگانی عمرِ رواں نہ پوچھ
سدا لکھتے ہوئے ملتے ہو راشدؔ
گلستانوں کو جادہ کر لیا کیا؟

---

دلیری کا یہ بنیادی سبق ہے
کسی کمزور پر حملہ نہ کرنا
تسخیر کی طلب ہو کہ تعمیر کا عمل
طاقت کے ساتھ ساتھ مہارت بھی چاہیے
اُسے خراجِ محبت ادا کروں گا ضرور
ذرا میں یاد تو کر لوں کوئی وفا اُس کی
ترے سانسوں کی گرمی ڈھونڈتا ہوں
غمِ ہجراں کی برفیلی شبوں میں

ممتاز راشدؔ لاہوری (انتخاب: ثمینہ سید)/لاہور

---

(ایک غزل حسن عباسی کے لیے)

اک ہجر ہے اور اس کا بیاں کچھ بھی نہیں ہے
اے عشق! مرے پاس یہاں کچھ بھی نہیں ہے
ہر چشم کو منظر کیا اک جلوہ نما نے
ورنہ تو بجز عکس بتاں کچھ بھی نہیں ہے
اک یادِ شبِ رفتہ کے مرقد پہ چڑھی یاد
ورنہ یہ چراغوں کا دھواں کچھ بھی نہیں ہے
کچھ پیڑ بہت دیر سے خاموش کھڑے ہیں
بستی میں مسافر کہ مکاں کچھ بھی نہیں ہے
اے منظرِ خوش رنگ! تجھے اور بناتے
ہاتھوں میں مگر تاب و تواں کچھ بھی نہیں ہے
یہ دشت ہماری بھی گزرگاہ تھا لیکن
اس دشت میں اے راہرواں! کچھ بھی نہیں ہے
ہر شے ہے یہاں صورتِ مہ تاب اُفق تاب
اس رات کے پردے میں نہاں کچھ بھی نہیں ہے

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع/لاہور

بے سمت سفر ہے جو مسافت سے بھرا ہے
اک ہجر مسلسل ہے جو ہجرت سے بھرا ہے
اک سانس کہ ہے رات کی دہلیز پہ بیٹھی
اک دل کہ غمِ یار کی حدت سے بھرا ہے
لگتا ہے شب و روز یہاں درد کا میلہ
گھر خالی نہیں ہے میاں وحشت سے بھرا ہے
یہ اس کی مشیت کہ معیشت کا ثمر ہے
جو شخص یہاں دیکھئے شدت سے بھرا ہے
دل اس کو سمجھتا ہوں میں واللہ نیازت
لبریز جو رقت سے خشیت سے بھرا ہے

نیازت علی نیاز/ مانسہرہ

غم زیادہ ہیں پس انداز بھی کر سکتے ہیں
آہ کو ضبط کا ہمراز بھی کر سکتے ہیں
نوکِ خاراں پہ بس اک قطرۂ خوں ٹپکا کر
خار کو پھول کا غماز بھی کر سکتے ہیں
پھول کے عہدِ گزشتہ کے سبھی رنج و الم
اک نئے دور کا آغاز بھی کر سکتے ہیں
بے بسی ایسی بھی کیا بات نہ ہونے پائے
ہم ترے درد کو آواز بھی کر سکتے ہیں
کیسا ناداں ہے انہیں صید کیے بیٹھا ہے
بے پر و بال جو پرواز بھی کر سکتے ہیں
اپنے ورثے کی حفاظت بھی ضروری ٹھہری
اپنی اقدار پہ ہم ناز بھی کر سکتے ہیں
نغمۂ یاس بھی ہم سوزِ دروں بھی لیکن
آپ چاہیں تو ہمیں ساز بھی کر سکتے ہیں

عرفانہ امر/ گوجرانوالہ

کیوں کر دھواں، نقوش بناتا ہے گال کے
سوچوں میں گم ہوں جیب سے سگرٹ نکال کے
میں دیر تک انہیں بھی سمجھتا رہا ہوں عشق
اُس نے سنائے مجھ کو فسانے کمال کے
کاغذ پہ کچھ درخت اُبھارے تمام شب
آئے ہیں کس طرف سے پرندے خیال کے
اُس کوزہ گر سے غیر مناسب ہے اختلاف
وہ صرف کُن سے خاک میں رکھ دے گا ڈھال کے
جو وقت کا ولی ہے، گداگر کہاں ہے وہ
چل دے گا اپنی راہ پہ سکے اُچھال کے
جب دل میں وہ نہ تھا تو نہایت سکون تھا
اُلجھا ہوں زندگی سے میں خواہش کو پال کے
ٹوٹا ہوا یہ دل بھی ہتھیلی پہ لے چلو
ٹکڑے ہیں چند کانچ کے رکھنا سنبھال کے
اب زیرِ دام آ نہ سکیں گے جناب ہم
کھائے ہیں سب فریب ان زُلفوں کے جال کے
اک شے بھی آفتاب سی روشن نہ ہو سکی
دیکھے ہیں آسماں نے ستارے اُجال کے

آفتاب خان/ لاہور

فکرِ وصال و حسرتِ دیدار سے پرے
میں آ گیا ہوں راہ کی دیوار سے پرے
میں دیکھتا ہوں اور کوئی چیز باغ میں
وحشت سرا و گرمیٔ بازار سے پرے
حیرت سے کر رہا ہوں نیا فلسفہ کشید
واعظ میں تیری عقل سے انکار سے پرے
باہر نکل کے خانۂ گنبد نما سے دیکھ
سایہ ہے اس مکان کا دیوار سے پرے
جنگل میں ایک شیر ہے اور شیرنی بھی ہے
جا کر تو دیکھئے کبھی کہسار سے پرے
خود کو تو لے گیا ہے وہ مجھ سے بہت ہی دور
سینے میں سانس لیتا ہے خنجر چلاتا ہے
اک زود رنج بھی دلِ بیمار سے پرے
ہے دیکھنے کا شوق تو آنکھوں کو بند کر
دنیا اُٹھائے پھینک دے اخبار سے پرے
حرف و ہنر کے باغ میں لے آیا دل کا درد
دنیا کے ہر فریب سے آزار سے پرے

سیّد کامی شاہ/ لاہور

بسا ہے وہ خیالوں میں سبھی جذبوں میں رہتا ہے
میں اس کو ڈھونڈنے نکلا ہوں جو سانسوں میں رہتا ہے
اب اس کے بعد میں رب سے اگر مانگوں تو کیا مانگوں
حنائی ہاتھ جب اُس کا مرے ہاتھوں میں رہتا ہے
اُجالا ڈھونڈھ لیتا ہوں ہر اک تاریک منظر میں
تمہارا چاند چہرہ جو مری آنکھوں میں رہتا ہے
اُسے اچھا نہیں لگتا یہ رنگ و نور کا میلہ
کبھی تو ہجر کا مارا ہوا سوچوں میں رہتا ہے
نہیں ہے ان ستاروں میں ستارا میری قسمت کا
یقیناً آج کل حسرت بھرے غاروں میں رہتا ہے
کسی بے آب آہو کی طرح اُمید تڑپے ہے
سنور کے سج کے ہرجائی مرا غیروں میں رہتا ہے
مری آنکھوں نے دیکھا ہے اُسے پاتال میں شاہد
تکبر کا وہ قیدی جو ابھی محلوں میں رہتا ہے

ہمایوں پرویز شاہد/ لاہور

یہ رونق جہاں کی ہماری نہیں
ہمیں پہلے والی خماری نہیں
بھلا ڈال چاہے خبر گیری کر
ہمیں پہلے سی بے قراری نہیں

پرانا تعلق نہیں اب رہا
نئے کی ہمیں وضع داری نہیں
ہمیں وحشتوں کا نہیں ڈر کوئی
جدائی کا اب خوف طاری نہیں
نئی نوکری ہے تو محتاط ہیں
نظر بھی تو ہم نے اُتاری نہیں
رگِ جان میں بس چکا ہے خدا
یہ دل اب نفس کا پجاری نہیں
ظفر کو کسی سے شکایت نہیں
رکھا دل پہ یہ بوجھ بھاری نہیں
ظفر اعوان/ ڈنمارک

کہ اتنا تو نہیں نادان کوئی
کہ سمجھے فرض کو احسان کوئی
کہانی ہوں، فسانہ ہوں میں قصہ
مگر ان سب کا ہے عنوان کوئی
وہ میرے دل میں ایسے رہ رہا ہے
کہ جیسے رہتا ہے مہمان کوئی
بھلا دینا ہمیں مشکل نہیں ہے
اسے سمجھے نہ پر آسان کوئی
اسے تم لوٹ کر دیتے ہو پہرہ
ہو دل کے چور یا دربان کوئی
ہمیں انجان کر کے اک جہاں سے
بنا بیٹھا ہے اب انجان کوئی
اُسے محسوس ہوگا درد اپنا
پڑھے گا جب مرا دیوان کوئی
دکھائی ہر جگہ دیتا ہے طاہر
مجھے رکھتا ہے اب حیران کوئی
طاہر عدیل/ ڈنمارک

جو بھی اپنے گمان تک پہنچا
وہی رب جہان تک پہنچا
پہلے مسکن زمین تھی میرا
عشق سے آسمان تک پہنچا
اُس کے قصے میں تھا مرا کردار
اس لیے داستان تک پہنچا
ایک پتھر گیا پرندے تک
اک پرندہ چٹان تک پہنچا
ہم تو سوئے ہوئے ہیں اور پانی
خطرے کے ہے نشان تک پہنچا
جلتے کپڑوں میں میں نے رقص کیا
سارا جنگل مچان تک پہنچا
دشت و دریا میں یوں لگا آسی
جیسے میں خاندان تک پہنچا
عدیل احمد آسی/ ڈنمارک

## کچھ

مجھے کچھ کہنا ہے
کیا کہنا تھا؟
حرف زبان کے نیچے
پناہیں ڈھونڈنے لگے
آس کی بارش قطرہ قطرہ
پلکوں کی منڈیروں سے ٹپکنے لگی
سوچوں کی چھلنی سے گریہ کرتے
گرتے لفظ بند کتابوں کی گود میں
سر رکھے سسکیاں بھرتے ہیں
تہمتوں کے بازار میں
اپنے سر پہ الزام رکھنے کو
کچھ بھی نہیں
حیف! محبت کرنے کی تہمت بھی نہیں

دل کے بھاری پن نے
خیالوں میں مٹی کے بند بنائے
کچھ کہنا چاہیے تھا
مگر یہ کیا؟
تمام لفظ اپنی قرات
بھول چکے تھے
میں تہی دامن
پھر اُسی دوراہے پر کھڑی
برسوں پہلے کا مناظر دیکھتی ہوں
جب لفظ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے
آسناتھ کنول/ لاہور

## یہ سال کیسے گزر گیا ہے

عجیب عکس خیال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
نئے نئے کچھ سوال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
تمام چہرے ہیں پھیکے پھیکے اُڑا اُڑا رنگ ہے سبھی کا
ہمیں شکستِ جمال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
نہ کوئی شانہ ہے اب سلامت نہ اب کسی کو ہے اتنی فرصت
یہ اُلجھے اُلجھے سے بال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
تھکے تھکے ہیں سب کے بازو بجھے بجھے ہیں یہ میرے بچے
سبھی کو چہرے نڈھال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
مجھے تو لگتا تھا جیسے اب کے یہ پھر نہ جانے کا نام لے گا
متاعِ رنج و ملال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا
مرے لیے تو یہ شامِ ہجر و فراق کافی تھی ہم نشینو
خیالِ شوقِ وصال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
ہزار بے نام وسوسوں کے حصار میں سوچ ہے سبھی کی
ندیم وہموں کا جال دے کر یہ سال کیسے گزر گیا ہے
ریاض ندیم نیازی/ سبی

# بقیہ انٹرویو صہیب مرغوب

ٹائم کا بڑا پابند ہوں ہمیشہ سے اسکول کے کلاس رومز کے سارے دروازے ہمیشہ میں نے کھولے ہیں۔ بلکہ جوان کے اسٹاف ممبر ہوتے تھے وہ تو آتے نہیں ہوتے تھے تو میں چھ بجے سارے دروازے کھولتا تھا۔

جب ایف سی کالج کا Exam ہوا اس لیے میرے نمبر کم آئے کہ مجھے ہر چیز کا گہرا تجزیہ کرنے کی عادت تھی اور وہ اتنا گہرا گیا کہ شاید ٹیچر کو بھی نہ پتہ ہو۔ اس زمانے میں میں نے بلیک ہول پہ ایک سائنس کی کتاب لکھی۔ جو 70 یا 80 صفحات پر مشتمل تھی جو کسی نے شائع نہیں کی۔ شیخ نیاز صاحب کا بہت بڑا شوروم ہوتا تھا۔ اُن کے پاس گیا۔ انہوں نے پہلے مجھے دیکھا پھر کتاب کو دیکھا کہا ہم نہیں شائع کر سکتے۔ ایسے کئی پبلشرز کے پاس پھیرے لگائے۔ مگر سب نے کہا ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

77 میں جب امتحان دیا اور اُس کے بعد جو چھٹیاں آئیں میں نے مکتبہ شاہکار جوائن کیا۔ عطش درانی صاحب چھوڑ گئے تھے۔ اُس کے بعد میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ''قافلہ'' ہوتا تھا اُس کا ڈپٹی ایڈیٹر بنا۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا معلومات کی دو جلدیں بنائیں جو رکی ہوئی تھیں۔ 32 اور 33 نمبر انڈیکس قاسم صاحب نے تیار کیا۔ کتابیں میں نے مرتب کیں۔ اُس وقت میں انٹر میں تھا۔ بعد میں اُس انسائیکلو پیڈیا کا کراچی راجہ ظفر الحق نے افتتاح کیا۔ یہ جو 33 جلدیں جب شائع ہوئیں تو اس میں سے ان تمام لوگوں کے نام غائب تھے۔ جنہوں نے مختلف مراحل میں کام کیا تھا۔ میرے سمیت کسی کا نام اس میں پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔

س: اس کی کیا وجہ تھی؟

بہر حال جو پرنٹر ہوتا ہے پبلشر ہوتا ہے وہی ہر چیز کا رائٹر بھی ہوتا ہے۔ سید قاسم محمود صاحب یہاں سے اچانک کراچی چلے گئے۔ اس زمانے میں تمام چیزیں شاید ردی کے بھاؤ دے دی ہوں گی۔ اس زمانے میں پھر میں نے بھٹو صاحب پر 5 کتابیں Compile کیں۔

س: بھٹو پر آپ اپنے آپ کو اتنا فوکس کیوں کرتے تھے؟

بات فوکس کرنے کی نہیں بات مارکیٹ کی ہوتی ہے۔ سیّد قاسم محمود صاحب پر اُس زمانے میں بہت قرضے چڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک ناول ٹرانسلیٹ کرایا۔ The Promise اُس کا نام ستار طاہر صاحب نے تجویز کیا۔ ''پیمانِ وفا'' آپ 77 کے بعد کا دور مدنظر رکھیں تو وہ پیمان وفا یا اس طرح کی چیزوں کا نہیں تھا۔ زمانہ تھا بھٹو کی زبردست مخالفت کا یا زبردست حمایت کا۔ میں نے سیّد قاسم محمود صاحب سے کہا کہ اگر آپ نے اپنے قرضے اُتارنے ہیں تو یہ جو ڈشنگ نما چیزیں ہیں ان کی جگہ قافلہ..... قافلہ میں سیریز اچھی تھی۔ جیسے انگلش لٹریچر کے کلاسیک ہیں وہ چھ چھ کے ٹرانسلیشن ایک ساتھ شائع کریں لیکن آپ جانتے ہیں ہمارے ہاں کلاسیک کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ بہت محدود سا طبقہ ہے جو ان لوگوں کو پڑھتا ہے لیکن قاسم صاحب اُن لوگوں کو اپروچ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ صلاحیت سے میرا مقصد ہے Advertisement وہ اشتہار بازی کا زمانہ تو نہیں تھا۔ اشتہار مہنگے تھے۔

س: بطور صحافی آپ کو بیرونِ ملک پاکستان کی نمائندگی کرنے کا کہاں کہاں موقع ملا؟

دوسرے صحافیوں کے برعکس غیر ملکی سفر کا کوئی شوق نہیں۔ دو چار یا پانچ دورے ایسے ہیں جو مجھے زبردستی کرنا پڑ گئے۔ شاید میں ان سے فرار ہو جاتا۔ اگر پھنس نہ جاتا مثلاً آفس نے مجھے 1989 میں عراق بھیجا۔ عراق کا سرکاری ٹرپ تھا۔ صدام حسین نے اپنی ہسٹری میں پہلی بار الیکشن کرائے تھے جہاں سارے گئے تھے اور کہہ رہے تھے بڑا دیانتدارانہ الیکشن ہیں۔ وہاں مجھے جا کر پتہ چلا کہ ہر تیسرا آدمی صدام کی سیکورٹی کا ایجنٹ ہے۔ وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کی میڈیا انڈسٹری انتہائی نوزائیدہ حالت میں ہے۔ کیونکہ میرے ساتھ جو صحافی برطانیہ امریکہ اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے تھے وہ اپنے ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز کرانے کے چکر میں تھے ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ ہم اس کا سوچ بھی سکتے۔

س: بطور صحافی آپ کو بیرون ملک نمائندگی کرنے کا کہاں کہاں موقع ملا؟

ج: دیکھیں جی ایک تو وہ دورہ تھا اُس کے بعد ظاہر ہے جو رپورٹ لکھی وہ عراقی گورنمنٹ کو پسند نہیں آئی ہوگی۔ کیونکہ اس میں ہم نے آغاز میں لکھا صدر صدام حسین کی خفیہ پولیس کے سائے میں جو الیکشن ہوئے وہ منصفانہ نہیں تھے۔ اس کے بعد امریکن گورنمنٹ

کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے مجھے مدعو کیا۔ 1982ء میں اس دورے سے بھی شاید میں آخری وقت میں بھاگ جاتا۔ مگر سین ایسا بن گیا کہ مجھے جانا پڑا گیا۔ ایک ماہ کا دورہ تھا۔ چھ سات ریاستیں تھیں۔ بہر حال اس دورے میں وژن بہت تبدیل ہوا اور امریکیوں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ ہم لوگ دشمن پیدا کرنے کے ماہر ہیں اور ہماری حکمت عملی اتنی کمزوری ہے کہ ہم بلاوجہ دوسروں کو دشمن بنا لیتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک ماہ کے قیام کے دوران ان کی عوام میں کچھ ایسا محسوس نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے مخالف ہیں یا وہ پاکستان کے مخالف ہیں۔ بلکہ عام آدمی کو تو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ پاکستان بھی کوئی ملک ہے۔ بہت سے لوگ کہتے تھے اچھا یہ عمران خان کے ملک سے آئے ہیں یا بے نظیر کے ملک سے آئے ہیں تو ہماری طرح ایک عام امریکی اتنا سیاسی نہیں ہے جتنے ہم سیاسی ہیں۔ یہاں تو موچی اور دھوبی بھی قومی امور پر تبادلہ خیال کرتا ہے وہاں ایم اے پاس بھی قومی امور پر تبادلہ خیال نہیں کرتے صرف جو اُن امور کے ماہر ہوں وہ تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ ہمیں جس چیز کا نقصان ہے وہ یہ کہ ہم تمام ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس میں ان کے یہودیوں کے زیر اثر میڈیا ہے۔ وہ اس کو بہت اچھالتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری عوام میں امریکہ کی تو بات نہیں کرتا۔ اگر یہاں ہندو بھی آ جائیں تو ان کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ بھی ہے اور تجربہ بھی ہے۔ یہاں اٹل بہاری واجپائی آئے تو ہم نے ان کا بڑا استقبال کیا۔ ایک دو جماعتوں کے علاوہ سب نے کیا لیکن جب ہمارے سوشل میڈیا پر یا ویسے میڈیا پر یہ خبر آتی ہے کہ ہم نے فلاں ملک کا پرچم جلا دیا اسی وجہ سے میں نے سوشل میڈیا پر بہت دشمنیاں مول لیں۔ اب استعمال نہیں کرتا۔ اُس پر بے تحاشا لوگوں نے پوسٹیں لگائی ہوتی ہیں۔ آج میں نے امریکہ کے جھنڈے کو جلایا۔ امریکہ مردہ باد وغیرہ میں نے سب کو یہی مشورہ دیا کہ ہم کون ہوتے ہیں کسی قوم کو مردہ باد یا زندہ باد کہنے والے۔ ہاں تو میں تو سب قومیں اللہ کی تخلیق ہیں۔ ہاں رویوں پر بات ہونی چاہیے۔ ہم جب کسی قوم کا پرچم جلاتے ہیں تو اُسے بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اگر کوئی میرے ملک کا جھنڈا جلائے تو میں ساری رات سو نہیں سکوں گا۔ تو اس طرح ہم کسی اور ملک کا جھنڈا جلاتے ہیں اور اس کے اخبار میں چھپتا ہے تو اُس ملک کے شہری بھی شاید ساری رات سو نہ پائیں۔ ہم جب دشمنیاں پالتے ہیں اس طریقے سے اس کا اظہار وہاں کے میڈیا پہ ہوتا ہے۔ میں نے ایک ماہ کے دورے کے دوران یہ محسوس کیا کہ امریکی عوام کے پاس تو وقت نہیں ہے سیاسی باتیں کرنے کا اور یہی حال یورپ کا ہے کہ وہ جو میڈیا میں آ جاتا ہے اس کو مان لیتے ہیں۔ اس لیے جب ان کے میڈیا میں یہ خبر چھپتی ہے کہ آج پاکستان نے امریکہ کو مردہ باد کہا ہے تو ان کا ردِ عمل ان میں ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا ہے کہ امریکی عوام اپنی رائے کو بھی بدلنے پر تیار رہتے ہیں۔ اگر ان کو Convince کر لیا جائے۔ میرے اپنے تجربے ہیں ہو سکتا ہے غلط بھی ہوں۔ جب ہم شخصیات کے خلاف مہم کو قوموں کے خلاف مہم میں تبدیل کر دیتے ہیں تو ملک خلاف ہو جاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے میڈیا میں انتہا پسند ہم سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد برطانیہ، قطر اور کئی اور ممالک میں بھی جانے کا اتفاق ہوا لیکن بہت سے دورے میں نے مسترد بھی کیے۔ مسترد سے مطلب مختلف جگہ سے دعوت نامے آئے، ریٹرن ٹکٹ بھیجے گئے۔ اس کی بنیادی وجہ نہ جانے کی یہ ہے کہ میرے جیسا کوئی بندہ جب باہر سے ہو کر یہاں آتا ہے تو اُسے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں کے معاشرے میں اخلاق اور دیگر حوالوں سے بڑی خوبیاں ہیں اور یہاں آ کر جب وہ اس سے اُلٹ معاملات نظر آتے ہیں تو پھر دُکھ بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ میرے بہت سے دوست ہیں جو باہر مقیم ہو گئے۔ مگر جب انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تو وہ یہاں آ کر ایڈجسٹ نہیں ہو پائے۔

س: آپ کو بڑے صحافیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ جو اَب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ چند ایک کا ذکر کریں اور کس کس کے ساتھ قربت رہی۔

ج: ان میں نذیر ناجی صاحب کے ساتھ میں نے بہت کام کیا اور پاکستانی صحافت میں لوگوں سے ملاقاتوں کا کوئی اتنا وسیع تجربہ نہیں ہے لیکن جتنا میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں نے لوگوں سے سنا ہے میں نذیر ناجی صاحب کو 100 میں سے 500 نمبر دیتا ہوں کیونکہ کسی بھی شعبے میں آپ چلے جائیں وہاں ایسے لوگ ملیں گے جو نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے لیکن نذیر ناجی صاحب نے ہمیشہ نئے آنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں اپنی بات کہوں تو جب وہ فورم کے انچارج تھے انہوں نے میری انگلی پکڑی میں ان کے ساتھ پولیٹیکل پیج بھی کرتا رہا ہوں جتنی حوصلہ افزائی وہ کر سکتے تھے اس سے بڑھ کر کی۔ ارشاد احمد حقانی صاحب کے ساتھ کام کیا۔ ان

سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ اظہر مسعود صاحب کے ساتھ کام کیا۔ ان کے بارے میں رائے تھی کہ وہ خبر دیکھ کے اندازہ لگا لیتے تھے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ عقابی نگاہوں سے کسی چیز کو پرکھنے کی عادت ان سے سیکھی۔

س: صحافیوں کو حکومت کی طرف سے پلاٹ اور دیگر مراعات جو دی جاتی ہیں ان کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

ج: جنگ میں، میں نے 36 سال گزارے۔ اس عرصہ میں صحافیوں کو پلاٹ اور پیسے دینے کی بہت سی لہریں اٹھیں۔ جو ہر ٹاؤن میں پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ اُس لہر میں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب پلاٹ تقسیم ہو گئے۔ کمیٹیاں بھی بنیں بہت سے نئے آنے والے بھی فیض یاب ہو گئے لیکن چونکہ میں ایسی بک جس کو گڈ بک کہتے ہیں اس کتاب میں میرا نام شامل نہیں رہا تو میرا نام اس حوالے سے جو مشکوک لسٹ ہوتی ہے اس میں شامل رہا۔ 1998ء میں نواز شریف دور میں اُن تین صحافیوں میں تھا جن کی لسٹ بنائی گئی کہ ان کو برطرف کر دیا جائے۔ ملیحہ لودھی، ارشاد حقانی اور صہیب مرغوب مجھے یہ جنگ گروپ نے نہیں بتایا لیکن باہر سے پتہ چلا کہ میرا نام بھی شامل ہے۔ بلکہ چھ سات ماہ تک مذاکرات چلتے رہے اور جنگ زیرِ عتاب رہا لیکن میں نے خود پھر اُسے زمانے میں Sunday Magazine چھوڑ دیا تاکہ پریشر کم ہو۔ حقانی صاحب کے ساتھ بھی معاہدہ ہو گیا کہ وہ دو کالم کم لکھیں گے۔ انٹرنیشنل ریلیشنز پر بھی لکھیں گے۔ ملیحہ لودھی کے ساتھ بھی اس طرح کا طے ہو گیا۔ میرے بارے میں ان کا فلسفہ تھا کہ اس بندے کو تو نکال ہی دو۔ کافی سینگ پھنسے رہے اور شیطان کی آنت کی طرح یہ فہرست دراز ہوتی گئی اور بعد میں یہ 33 تک چلی گئی۔ اب ایسے شخص کو جو ہر دور میں مشکوک ہو اُس کے ساتھ پیسوں یا پلاٹوں کی سیاست ہو نہیں سکتی۔ بہت سی آفرز بھی ہوئیں لیکن میں نے ہمیشہ اپنی مرضی سے لکھا۔

س: زندگی میں کبھی کسی سے محبت ہوئی؟

ج: دیکھیں مجھے دو تین چیزیں کو کبھی سمجھ نہیں آئی۔ ایک یہ کہ یہ سالی محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کی مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی۔ ہاں البتہ ملنا جلنا رہا ہے۔ اگر آپ اس کو محبت کہتے ہیں۔ چھ ساتھ خواتین وحضرات سے اس میں سے حضرات نکال دیں تو میں نے ایک PIA پہ رائٹ اپ لکھا تھا جس میں میں نے بتایا تھا کہ جو جہاز ہے اس کی بناوٹ کیسی ہے۔ کچھ چیزیں جو کمزور رکھنی ہیں ان کو دانستہ کمزور رکھا گیا ہے جیسے اس کا شیشہ ہے اس پہ اگر آپ تین ہارس پاور کا مکا ماریں گے تو ٹوٹ جائے گا۔ ایسے اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو ہر چیز کے دو دو تین تین سسٹم ہیں۔ انجن دو ہیں اگر ایک بند ہو بھی جائے گا تو دوسرا سانس لینے کے لیے ہو گا اور ہوا کے تین راستے ہیں۔ دو بند ہو جائیں گے تو پھر بھی سانس آتی رہے گی۔ اس کے بعد کافی ایئر ہوسٹسز کے فون آئے۔ ایک کے گھر آنا جانا بھی رہا۔ اس کے بعد ایک اسٹوڈنٹ تھی اس نے تو جان ہی نہیں چھوڑی کبھی اس پارک میں، کبھی اُس پارک میں اور میں حسبِ عادت اور حسبِ روایت وعدہ کر کے کبھی نہیں پہنچا۔ پھر اس کی شادی بھی ہو گئی۔ دو بچے بھی ہو گئے تب بھی اس کے فون آتے رہے۔ میں نے پھر بیگم کی بات کرائی یہ سلسلہ ہے اس نے کہا کوئی بات نہیں میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔ ایک ماڈل ٹاؤن میں رہتی تھی۔ اُس کے ساتھ بھی تھوڑا بہت ملنا جلنا رہا۔ اس کے ساتھ مل کے فوٹو گرافی بھی کر لی۔ اس شوق نے فوٹو گرافر بھی بنا دیا۔

س: آپ کی زندگی کا کوئی خواب جس کی فوری تکمیل چاہتے ہوں؟

ج: میں قطعی طور پر جذباتی آدمی نہیں ہوں کوئی ایسی پلاننگ کرتا نہیں ہوں جو ''فوری'' طور پر منحصر ہوں۔ بہت دور اندیش آدمی ہوں اور بڑی لانگ ٹرم پلاننگ کرتا ہوں اور زندگی میں مجھے کچھ ایسے مسئلے درپیش نہیں آئے کہ فوری پلاننگ کی ضرورت پڑ جائے۔

س: ارژنگ کے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: پیغام یہ ہے کہ دیکھیں جتنے بڑے بڑے لوگ ہیں انہوں نے اپنی کامیابی کے سفر کا آغاز پہلے قدم سے کیا ہے یعنی چھوٹے پیمانے پر دنیا کا جو سب سے بڑا بک سیلر ہے جس کا ساڑھے چار ارب ڈالر کا ٹرن اوور ہے اُس نے اپنے کام کا آغاز اپنے گھر کے گیراج میں کتابیں رکھ کر کیا۔ اس طرح کئی بڑے لوگ ہیں جن کی زندگی کا آغاز کچرا چننے سے ہوا۔ کئی کے پاس ایک وقت کا کھانا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس میں نوجوان نسل کے لیے پیغام ہے کہ اگر وہ کچھ بننا چاہتے تو کسی بھی کام سے آغاز کرنے میں عار محسوس نہ کریں۔

س: آپ نے بھرپور صحافتی زندگی گزاری ہے اس میں بڑے بڑے دلچسپ واقعات بھی رونما ہوتے ہوں گے۔ ایک دو قارئین سے شیئر کریں گے۔

ج: میں قارئین سے ایک بات شیئر کرنا چاہوں گا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا حق لے سکتے ہیں۔ میں نے 8 یا دس

مقدمات لڑے ہیں اور اپنا حق حاصل کیا ہے۔ اسکول کے زمانے میں جب کالج میں رزلٹ آیا ایف ایس سی کا تو میرے نمبر کم تھے۔ ظاہر ہے میری ہینڈ رائٹنگ بہت خراب تھی۔ پھر میں نے برٹش کونسل اور امریکن سنٹر کا سہارا لیا تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ میں نے جا کر بورڈ میں مارکنگ کو چیلنج کیا اور ان کو میں نے لیگل نوٹس بھیجا کہ آپ نے قابل اعتماد سسٹم قائم نہیں کیا۔ میرے پرچے بغیر فیس کے ری چیک کریں۔ اس زمانے میں یہ پرچے مارکیٹ میں بیچ دیتے تھے۔ ان دنوں شاپر تو پولی تھین کے تھے نہیں تو دکاندار اس میں چیزیں بیچا کرتے تھے۔ میں نے وہ سارے لفافے اکٹھے کیے اور اس میں جہاں جہاں مارکنگ کی غلطیاں تھیں ان کی نشاندہی کر کے جنرل ضیاء الحق کو بھیج دیں۔ مجھے لیٹر ملا جنرل عباد کی جانب سے کہ آپ کا کیس ہم نے چیئرمین بورڈ کو بھیج دیا ہے۔ خواجہ غلام فرید صاحب چیئرمین ہوتے تھے اور ڈپٹی کنٹرولر تھے۔ اقبال بٹ مولوی اصغر تھے۔ اسسٹنٹ کنٹرولر سیکریسی مجھے ایک دن چیئرمین صاحب کا خط ملا کہ چیئرمین صاحب 11 بجے ہفتے کے دن بالمشافہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ بوقت ملاقات انہوں نے پوچھا دو کروڑ کا لیٹر آپ نے لکھا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں تو کہتے ہیں اس سے آپ کو پتہ ہے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔ یہ کہ دو کروڑ کا لکھا ہے تو آپ تو پاگل ہی ہیں۔ میں نے کہا ہاں دو کروڑ کی رقم کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ کیا لکھا ہے آپ بھی لگا لیں۔ اس کے بعد چونکہ خواجہ صاحب فلاسفی کے ٹیچر تھے۔ بڑی بحث ہوئی۔ ان کے ساتھ Subjective اور Objective مارکنگ پر انہوں نے کہا یہ اُردو انگریزی جیسے نمبر تو ہیں نہیں۔ ان میں آپ کے نمبر نہیں ہوئے ہوں گے۔ پونے دو گھنٹے بحث ہوئی۔ ایک ایف سی کے طالب علم نے فلاسفی کے ماہر چیئرمین بورڈ کے ساتھ میٹنگ کی۔ اس سے پہلے مجھے کنٹرولر امتحان نے گھر میں وہ فارم بھجوایا کہ آپ یہ بھر کر بھیج دیں۔ ساتھ بیس روپے دے دیں تو ہم آپ کے پرچے دوبارہ چیک کر دیتے ہیں۔ اتنا میں نے ان کو تنگ کیا۔ اپنے خطوں کے ذریعے اور خط لکھنے کے لیے میں نے امریکن سنٹر میں قانون کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ اس وقت ڈائریکٹر یا ڈپٹی ڈائریکٹر ہوتے تھے۔ اسلم مجاہد صاحب انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہاں پر میں نے کہا جی ثانوی تعلیمی بورڈ مجھے خطوں کا جواب نہیں دیتا تو میں دیکھ رہا ہوں کہ کون سا ایسا قانون ہے جو خطوں کا جواب نہ دینے والے پر اپلائی ہوتا ہو تو انہوں نے کہا یہ تو آپ کو یہاں نہیں ملے گا۔ یہ تو امریکہ کا قانون ہے۔ میں نے کہا شاید کوئی راہنمائی مل جائے۔ انہوں نے پھر مجھے کمرے میں بلایا۔ چائے پلائی۔ پھر کسی وکیل سے بات کی۔ اس نے کہا ٹاٹ کا قانون ہے لیکن یہ یہاں پڑھایا جاتا ہے نافذ نہیں ہوتا۔ میں نے ٹاٹ کے قانون کے تحت ان کو لیٹر بھیجا۔ میں نے کہا انہوں نے کون سا پڑھا ہوگا۔ یہ نافذ نہیں ہوتا۔ قانون تو قانون ہے تو اس دوران ان کو جنرل ضیا کا لیٹر بھی آ گیا۔ اس کے بعد جواب آیا کہ ہم نے آپ کے پرچے ری چیک کیے ہیں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں پاکستان کا واحد آدمی ہوں جس کے پرچے بورڈ نے بغیر فیس کے چیک کیے۔ اس کے لیے علاوہ میں نے اور بھی مختلف محکموں کے خلاف مقدمات اصولوں کی بنیاد پر جیتے۔

س: آپ کی طرف سے جو پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں وہ اکثر سچ ثابت ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس بھی کوئی چڑیا ہے؟

ج: زندگی میں جو دو پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئی ہیں باقی اللہ کے فضل سے سب درست ثابت ہوئی ہیں۔ جہاں تک چڑیا اور طوطا مینا کا تعلق ہے تو میں 99 فیصد تجزیے گراف روٹ پہ بیٹھ کر کرتا ہوں۔ 50 فیصد تجزیے Information پر کرتا ہوں مجھے PA کے کمرے بہت پسند ہیں۔ مجھے اپنا بطور صحافی تعارف کروانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ ابھی بھی مجھے بہت سے لوگ نہیں پہچانتے ہوں گے۔ میں جہاں بیٹھا ہوں گا ایسے گوتم بدھ کی طرح لوگ سمجھیں گے یہ پتہ نہیں کون بیٹھا ہوا ہے۔ ایک وزیر تھے میں ان کو پنجاب اسمبلی ملنے ان کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنی گپ شپ میں لگے رہے۔ کابینہ کا اجلاس ہوا تھا اس دن۔ میں کابینہ کی مخبری لینے گیا تھا۔ وہ تیار بتا رہے تھے فلاں نے یہ کہا میں نے یہ کہا۔ فلاں نے یہ کہا میں نے یہ کہا۔ ان کو خیال ہی نہیں آیا کہ جو سامنے بیٹھا ہے وہ اخبار میں ہے۔ وہ سمجھے کہ کوئی ملاقاتی ویسے گھس آیا ہے۔ جس کا کام میں نے نہیں کرنا۔ 20 منٹ بعد انہوں نے پوچھا تو بتانے پر پتہ چلا اُن کو اس طرح بیٹھنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جتنے بھی کابینہ کے اجلاس ہوئے اس زمانے میں وہ سارے میں نے چھاپے۔ ایک لا منسٹر ہوتے تھے۔ ان کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ فون پر بات کر رہے تھے۔ اچھا بینک بنانا ہے اچھا ٹی وی تو کنسٹی ٹیوشن میں نہیں ہے۔ اچھا سٹیٹ بنک...... جیسے کوئی جان بوجھ کے ادھوری بات کر رہا ہوتا ہے تو انہوں نے

مجھے کہا کچھ لوگ ملنے آ رہے ہیں وہاں ایک اور جگہ ہے وہاں آپ جا کر بیٹھیں پھر ملتے ہیں۔ وہاں میں نے 45 منٹ انتظار کیا تو خبر آ گئی۔ پنجاب حکومت ٹی وی اسٹیشن نہیں بنا رہی۔ ان دنوں یہ نعرہ بہت پاپولر تھا جاگ پنجابی جاگ۔

یہ خبر میں پیٹ میں لے کے گھر آ گیا۔ میں نے پھر ایک رائٹ اپ جنگ میں لکھا کہ پنجاب حکومت دو بینک بنائے گی اور ٹیلی وژن بنانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اس کے بعد ایک بیت المال بنا اور ایک پنجاب بنک بنا۔ تو میں تجزیے تبصرے اس طرح گراف روٹ پہ کرتا ہوں اس طرح اور بھی بہت سی پیشین گوئیاں ہیں۔ جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ جیسا کہ کئی دہائیوں سے بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمہ کی خوشخبری مختلف حکومتوں کے ادوار میں عوام کو سنائی جاتی رہی اور میں نے ہمیشہ حقائق پر مبنی رائٹ اپ لکھ کے عوام کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایسا ممکن نہیں۔

س: اب تک آپ کتنے رائٹ اپ لکھ چکے ہیں اور کیا حکومتی سطح پر آپ کا اعتراف کیا گیا؟

ج: اگر آپ گوگل پر سرچ کریں گے۔ صہیب مرغوب تو آپ کو ایک چیز آئے گی Most Popular name of 1980 and 1990 ان دو دہائیوں میں کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر میں نے نہ لکھا ہو۔ سیاست، خواتین، بچے، جرم، فلم وغیرہ کوئی ایسا پنگا نہیں ہے۔ جس میں میں نے ہاتھ نہ ڈالا ہو اور کام میں بہت باریکی اور گہرائی سے معاملے کی تہہ تک جانے کا مجھے جنون ہے۔

## لبنیٰ صفدر/ لاہور

دل کی آیات میں آ جاتا ہے
وہ مناجات میں آ جاتا ہے
منکشف ہوتا ہے مجھ میں پہلے
پھر کرامات میں آ جاتا ہے
پہلے تو روگ بنے دل کا اور پھر
ہجر ظلمات میں آ جاتا ہے
آنکھ روتی ہے مگر حد یہ ہے
اشک برسات میں آ جاتا ہے
ایک گلشن سا مہک اُٹھتا ہے
وہ خیالات میں آ جاتا ہے
کسی شہنائی کی ڈھن میں چھپ کر
درد بارات میں آ جاتا ہے

............

چشم نمناک پہ رکھ دینا تھا
آگ کو خاک پہ رکھ دینا تھا
کوئی چہرہ تو مجھے مل جاتا
تو نے بس چاک پہ رکھ دینا تھا
کوئی تو جگنو، کوئی تارا ہی
میری پوشاک پہ رکھ دینا تھا
اپنے پیروں میں جگہ دینی تھی
مجھ کو افلاک پہ رکھ دینا تھا
حیرتی آنکھ کا لمحہ کوئی
حد ادراک پہ رکھ دینا تھا

## ایاز محمود ایاز/ پیرس

غموں میں ڈھال گیا لوٹ کر نہیں آیا
جو پچھلے سال گیا لوٹ کر نہیں آیا
بچھڑ گیا ہے وہ خوشیاں سمیٹ کر اور غم
مجھے سنبھال گیا لوٹ کر نہیں آیا
عجب طلسم ہے اس کی حسین آنکھوں میں
ادھر خیال گیا لوٹ کر نہیں آیا
میں خود بھی سوچ میں گم ہوں کہ تیرے آنے سے
کدھر ملال گیا لوٹ کر نہیں آیا
عجیب شخص تھا کھینچ کر صلیب وقت پہ وہ
ہمیں اُچھال گیا لوٹ کر نہیں آیا
کٹا وہ شہر سے، پھر جب تری گلی سے کٹا
شکستہ حال گیا لوٹ کر نہیں آیا
ستم ظریف رواجوں کی اوٹ میں ایازؔ
مرا ہلال گیا لوٹ کر نہیں آیا

............

روٹھ جانے کی عادتیں نہ گئیں
دل جلانے کی عادتیں نہ گئیں
زخم کھا کر بھی تجھ سے، نام ترا
گنگنانے کی عادتیں نہ گئیں
پیار سے جو بھی مل گیا اس کو
دکھ سنانے کی عادتیں نہ گئیں
چاند کی، شرم سے نقابوں میں
منہ چھپانے کی عادتیں نہ گئیں
دو دلوں کو اُجاڑ کے ہنسنا
یہ زمانے کی عادتیں نہ گئیں
چاند جیسا ہر اک حسیں چہرہ
دل کو بھانے کی عادتیں نہ گئیں

## شاعری کو اظہار کی تمام اصناف پر فوقیت حاصل ہے

## غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس نے اپنے اندر بہت سی اصناف کو سمویا ہوا ہے

## شعرا کے درمیان مخاصمت اور گروہ بندیاں کوئی نئی بات نہیں

### نوجوان شاعر آصف نیاز سے آغا تنویر کی گفتگو

آصف نیاز گزشتہ کئی برسوں سے شعر و ادب سے وابستہ ہیں۔ اگر چہ وہ ادبی محفلوں میں کم شرکت کرتے ہیں مگر پھر بھی عصری ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ سادہ، آسان اور شگفتہ زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ بے ساختگی ان کی شاعری کا نمایاں عناصر ہے۔ پہلا شعری مجموعہ ''اب یہاں کوئی نہیں'' کے نام سے زیر طبع ہے۔ ماہنامہ ارژنگ نے ایسے نوجوان شعراء کے لیے بھی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا انٹرویو نذر قارئین ہے:

س: اپنی ابتدائی تعلیم اور بچپن سے متعلق کچھ بتائیں۔

ج: آبائی شہر منگلا ڈیم ضلع جہلم ہے۔ مگر اب گزشتہ کئی دہائیوں سے لاہور میں مقیم ہوں۔ ابتدائی تعلیم منگلا گورنمنٹ ہائی اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور میں تعلیم مکمل کی۔

س: شاعری کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج: شاعری کی طرف بچپن سے ہی رُجحان تھا۔ شروع میں بچوں کی نظمیں لکھا کرتا تھا۔ پھر بعد میں غزل سے آشنائی ہوئی تو میں اس صنفِ سخن کو اپنا دل دے بیٹھا اور باقاعدہ غزل کہنے لگا۔

س: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ غزل میں مکمل طور پر اظہار ممکن ہے؟

ج: غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس نے اپنے اندر بہت سی اصناف کو سمویا ہوا ہے اور اس میں وقت زمانہ اور ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے اور بدلنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ اس لیے روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ جدید مضامین کو بھی یہ بھرپور طریقے سے اپنے اندر سمو رہی ہے۔ غزل کو میں اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ سمجھتا ہوں۔

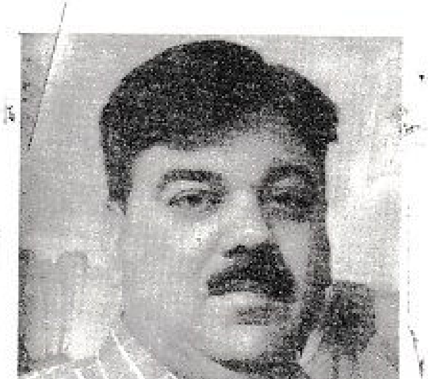

س: کیا آپ نظم بھی لکھتے ہیں؟

ج: زبان کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے نظم بھی لکھ لیتا ہوں لیکن میری محبوب صنف سخن غزل ہی ہے جس میں سہولت سے میں اپنے دل کا حال بیان کرتا ہوں۔

س: مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور کیا مشاعرہ فی زمانہ مثبت سرگرمی ہے یا منفی؟

ج: مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتا ہوں۔ اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کاروبار سے فرصت نہیں ملتی لیکن میں اس کو ایک مثبت سرگرمی سمجھتا ہوں۔ یہ ایک ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ اس سے ایک تو اچھا شعر لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے دیگر شعراء سے بڑھ کر داد ملے۔ دوسرا یہ کہ نئے لکھنے والوں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔

س: کیا شاعری سے ملک اور قوم کی خدمت کی جا سکتی ہے؟

ج: شاعری کو اظہار کی تمام اصناف پر فوقیت حاصل ہے۔ ماضی میں جنگوں میں فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جذباتی اشعار پڑھے جاتے تھے۔ مذہبی رسومات ادا کرتے ہوئے بھی زمانہ قدیم میں شاعری کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اسی طرح قوم میں نئی روح پھونکنے کے لیے قیام پاکستان سے قبل اقبال کی شاعری نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد 65 کی جنگ میں گائے جانے والے ملی نغموں نے پاکستانی فوج کے حوصلے بہت بڑھائے اور جنگ جیتنے میں کافی مدد ملی۔

س: آپ شاعری سے کیا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے ہیں؟

ج: شاعر خدا کی زمین پر امن کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ مثبت سوچ کا حامل ہوتا ہے میری خواہش بھی یہی ہے کہ پاکستان کیا پوری زمین امن کا گہوارہ ہو۔لوگ پیار محبت سے رہیں اور ہر طرف خوشحالی ہو۔

س: شعرا میں گروہ بندیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: شعراء کے درمیان مخاصمت اور گروہ بندیاں کوئی نئی بات نہیں ۔ یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ایسا ہونا نہیں چاہیے اور اگر ہو تو نظریاتی سطح پر ہو ذاتی سطح پر نہ ہو۔

س: شعراء کی کتب تو اب کوئی نہیں پڑھتا اور دکان دار بھی رکھنے کے لیے تیار نہیں۔ایسی صورت حال کیا مایوس کن نہیں؟

ج: بالکل بھی مایوس کن نہیں۔ آپ کی بات درست ہے۔مگر شاعری پڑھنے کا میڈیم تبدیل ہو گیا ہے۔لوگ اب موبائل پر ہی سب کچھ پڑھ لیتے ہیں۔کتاب خریدنے کی زحمت کیوں کریں۔ جبکہ سب کچھ مفت مہیا ہے۔

آخر میں منتخب کلام

روشنی ہوتی نہیں ہے روشنی کے بعد بھی
تیری ہی تیرگی ہے تیرگی کے بعد بھی
پھر وہی بے اختیاری پھر وہی روزِ جزا
زندگی ملتی نہیں ہے زندگی کے بعد بھی
اس قدر مایوس مجھ کو کر دیا حالات نے
دل فسردہ رہتا ہے میرا خوشی کے بعد بھی
اُس کے آگے سچ کہوں میری انا کوئی نہیں
مجھ کو اچھا لگتا ہے وہ بے رُخی کے بعد بھی
ہے کرم اُن پر خدا کا بے بہا آصف نیاز
مل گئی جس کو ہدایت گمرہی ہے بعد بھی

..................

میں ہوں پیاسا صحرا جیسے
وہ ہے بپھرا دریا جیسے
اندر ایسے خالی خالی
کوئی ویراں کمرہ جیسے
اُس سے رشتہ یوں ٹوٹا ہے
ٹوٹ گیا ہو دھاگا جیسے
اس کو دیکھ کے یوں لگتا ہے
وہ ہے سچ مچ میرا جیسے
دکھ میں ساتھ وہ یوں ہوتا ہے
دھوپ میں اپنا سایا جیسے
آصف اپنا حال اب یوں ہے
کوئی سوکھا پتہ جیسے

## بہار کے آخری دن

شبیں مختصر تر ہوئی جا رہی ہیں
سویرا مگر اب بھی اجلا نہیں ہے
سحر کے افق پر ہیں پرچھائیاں کیوں؟
تمہارے بنا کچھ بھی سندر نہیں ہے!
وگرنہ تو یہ موسم گل کی گھڑیاں
سنا ہے ہر اک رُت سے زیادہ حسیں ہیں
جدائی کے موسم میں یوں لگ رہا ہے
سحر شب گزیدہ ہوئے جا رہی ہے
عامر بن علی/ جاپان

## سمندر کی لہریں

جب آتی ہیں
خوشیاں لے کر آتی ہیں
ساگر کی لہروں میں ایسا جادو ہے
ساحل سے ٹکرا کر جب واپس جائیں
جاتے جاتے سنگ اپنے کچھ رنج و غم
تھوڑا درد بھی ساتھ بہا لے جاتی ہیں
پھر آئیں تو نت نئی خوشیاں لاتی ہیں
عامر بن علی/ جاپان

## غزل

ایک دیا اور ایک گلاب
مٹھی بھر ہیں میرے خواب
آئینے توڑ کے بہہ نکلا
سندر چہروں کا سیلاب
پھول کے اندر تیرتا ہے
نیلے پانی کا تالاب
ان آنکھوں کی جھیلوں تک
اُڑ کر جائے آپ کتاب
گر کر خود ہی ٹوٹ گئی
بوتل میں تھی تیز شراب
دید پڑی تو اور بڑھے
رنگ ہزار، ہزار سراب
حسن عباسی/ لاہور

# ادبی خبریں/تقریبات

## آہ مشکور حسین یاد

لاہور کے بزرگ ترین اور نامور ادیب وشاعر پروفیسر مشکور حسین یاؔد 11 نومبر 2017ء کی صبح لاہور میں انتقال فرما گئے۔ ان کی عمر 92 سال تھی۔ ان کی نماز جنازہ دو دن بعد 13 نومبر کو جامع محمدی، حالی روڈ گلبرگ لاہور میں ادا کی گئی جس میں کثیر تعداد میں اہل قلم بھی شریک ہوئے۔ موصوف نامور انشائیہ نگار بھی تھے اور ماہر غالبؔ بھی۔ نظم ونثر میں ان کی کئی کتب شائع ہوئیں۔

## اظہارِ افسوس

میلسی میں مقیم ممتاز شاعر اور ادیب جناب خورشید بیگ میلسوی کے نوجوان صاحبزادے گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ڈاکٹر خورشید بیگ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ غم کی اس گھڑی میں ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم دُعا گو ہے۔

## رشید عثمانی انتقال کر گئے

اُردو اور سرائیکی کے نامور شاعر رشید عثمانی خیر پور ٹامے والی میں انتقال کر گئے۔ وہ گزشتہ 45 برس سے شعروادب سے وابستہ تھے اور اُن کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پہ آ چکے ہیں۔ اُن کا کلام اور حالاتِ زندگی بی اے کے پنجابی نصاب میں بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل دے۔ (آمین)

## صائمہ بخاری کو صدمہ

معروف شاعرہ صائمہ بخاری کے خاوند گزشتہ دنوں جہانِ فانی سے رُخصت ہو گئے۔ ادارہ ارژنگ کی ٹیم اس دکھ میں ان کے ساتھ شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آمین

## اقبال راہی کو صدمہ

معروف شاعر اقبال راہی کے جوان بیٹے گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ کچھ عرصہ سے بیمار تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## اظہارِ افسوس

نامور ادیب، نقاد اور شاعر احمد صغیر صدیقی گزشتہ دنوں امریکہ میں وفات پا گئے۔ علمی، ادبی حلقوں نے ان کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔

## ساندل کالج بیادِ اقبال مشاعرہ

رپورٹ (شہزاد بیگ) ساندل کالج کا بیاد اقبال مشاعرہ گزشتہ دنوں کالج آڈیٹوریم میں ملک کے نامور شاعر، محقق اور عظیم دانشور ڈاکٹر پروفیسر ریاض مجید کی زیرِ صدارت منعقد ہوا جس میں ملک کے ممتاز شعراء کرام نے شرکت کی۔ ساندل کالج کے اساتذہ طلبا اور والدین نے بھرپور شرکت کر کے اس مشاعرہ کو جلا بخشی۔ تقریبات اقبال کے پہلے حصے میں بچوں نے کلام اقبال پیش کیا۔ جبکہ دوسرے حصے میں طرحی مشاعرہ ہوا جس میں اساتذہ اور سٹوڈنٹس نے بھرپور شرکت کی۔ طرح مصرعہ تھا ''محبت مجھے ان جوانوں سے ہے'' سامعین و حاضرین اور شعرا کرام نے طرح غزلوں کو بے حد پسند کیا۔ تیسرے اور آخری حصے میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی یاد میں ایک شاندار اور یادگار مشاعرہ منعقد ہوا جس کے مہمانانِ خصوصی حسن عباس رضا (اسلام آباد) شفقت اللہ مشتاق (ایڈیشنل کمشنر) سعد اللہ شاہ (لاہور) چودھری محمد اشرف مہمانان اعزاز شبیر حسین بٹ (شیخوپورہ)، صوفیہ بیدار (آر ڈی آرٹس کونسل) حسن عباسی (لاہور) تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض شہزاد بیگ اور رضوان رشید نے بطریق احسن سرانجام دیے۔ منتظمین میں چودھری محمد عباس پرنسپل اور کالج سٹاف شامل تھا۔

## بزمِ فکرادب ساہیوال/ سرگودھا کی چوتھی سالانہ تقریب تقسیم ایوارڈز وکتب

گزشتہ دنوں ساہیوال/ سرگودھا کی ادبی تنظیم بزمِ فکرادب کے زیرِ اہتمام چوتھی سالانہ تقریب تقسیم ایوارڈ کتب و محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کئی کتابوں کے خالق ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ نے کی۔ سردار ضیغم حسن خان مہمان خصوصی تھے۔ تقریب تین حصوں پر مشتمل تھی۔ جس میں شعرا اور صحافیوں کو ایوارڈ دیے گئے۔ دوسرے حصے میں کتب تقسیم کی گئیں اور آخر میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

# تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: نعت میرا انتخاب/شاعر: عبدالخالق آرزو/صفحات: 160 /تبصرہ نگار: قمر رضا شہزاد

ناشر: مدر لینڈ، لاہور

---

اردو شاعری میں نعت سب سے زیادہ بابرکت صنفِ سخن اس لیے بھی ہے کہ یہ کسی شاعر کے ہاں اس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جب وہ عشق مصطفےٰ ﷺ سے سرشار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے نعت کہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی شاعر لکھ سکتا ہے جسے آقائے دو جہاں نے اس کے لیے چن لیا ہوتا ہے۔

خالق آرزو کو انہی چنیدہ شاعروں کی عشق مصطفےٰ ﷺ میں ڈوبی ہوئی نعتوں کا انتخاب شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ بلاشبہ جہاں یہ اس کے لیے آخرت کا توشہ ہے وہاں وہ پڑھنے والوں کے لیے بھی ایک بڑا تحفہ ہے۔ یہ انتخابِ نعت پاکستان کے تقریباً اہم نعت گووں کی نعتوں سے مزین ہے۔

میری دعا ہے خداوند کریم اس کی یہ سعادت قبول فرمائے اور آخرت میں اس کے لیے نجات کا وسیلہ بنائے۔ آمین

نام کتاب: الف (اللہ) میم (محمدؐ) / مصنف: ڈاکٹر محسن مگھیانہ/صفحات: 392 / قیمت: 250 روپے/تبصرہ نگار: انور سدید

ناشر: جہانگیر بکس، لاہور

---

ڈاکٹر محسن مگھیانہ بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ وہ زندگی کے ہر واقعے کو شگفتہ نظری سے دیکھتے ہیں اور پھر ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی طرح گراں بار انسان کو لطافت و بہجت سے سبکسار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل جب سنا کہ وہ حج بیت اللہ سے سرفراز ہو کر بخیر و عافیت واپس آ گئے ہیں تو مجھے یقین تھا کہ وہ اس روحانی سفر کی تفصیل میں اپنے احباب کو شامل کرنے کے لیے سفرنامہ بھی لکھیں گے۔ گزشتہ روز جب ان کی کتاب ''الف میم'' موصول ہوئی تو جیسے میرے خیال کی عملی صورت سامنے آ گئی۔ میں نے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کا فلیپ پڑھا، پھر باقی احمد پوری کی اس تخلیقی واردات سے گزرا جو انہوں نے یہ سفرنامہ حج پڑھتے ہوئے محسوس کی تھی اور اس کتاب کا نظر افروز دیباچہ لکھا۔ قریباً چار سو صفحات کے مطالعے کے بعد نہ صرف تازہ دم ہو گیا بلکہ اس سفرِ مقدس کی تجدید بھی ہو گئی جو میں نے 1989ء میں کیا تھا۔ اس سفرنامے میں میری ملاقات دو محسن مگھیانویوں سے ہوئی۔ ایک محسن مگھیانوی عقیدت کا مجسمہ ہے اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے ذرے ذرے سے نور کی کرنیں کشید کر کے اپنے باطن کو روحانی کیف سے سرفراز کر رہا ہے۔ ''الف'' کے حصے میں بندگی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے تو شوق کی وارفتہ خیالی دیدنی ہے۔ میم کے حصے میں عقیدتِ نبوی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ دوسرا محسن مگھیانوی ایک عام انسان ہے اور ارضِ حجاز پر ان تمام مشکلات کا سامنا صبر و استقامت سے کر رہا ہے جو ہر سال لاکھوں حجاج کو درپیش ہوتی ہیں لیکن جن کا علاج انسانی منفعت پسندی کی وجہ سے ممکن نہیں ہے۔ محسن مگھیانوی نے اس سفرِ مقدس کے دوران آنکھوں کے دریچے کھلے رکھے اور وہ تمام واقعات سمیٹ لیے جو انہیں مکہ و مدینہ کے قیام کے دوران پیش آئے۔ بظاہر یہ سفرنامہ حج اس نوع کے دوسرے سفرناموں سے مختلف نہیں لیکن اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس سفرنامے کو محسن مگھیانہ نے لکھا ہے جن کی عینک کو نمبر اور رنگ دوسرے سفرنامہ نگاروں سے مختلف ہے۔ اس سفرنامے کے چھوٹے چھوٹے ابواب پر کہیں افسانے کی کیفیت ملتی ہے، کہیں رپورتاژ کی خاصیت موجود ہے اور جب روح کی سرشاری کا ذکر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مگھیانہ نے آپ کی انگلی پکڑ لی ہے اور وہ خود معلم کی صورت میں آپ کو حج کے مختلف مراحل طے کرا رہے ہیں اور ہمیں دین و دنیا دونوں کے مزے لینے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ اس سفرنامے میں مجھے جس مزاح نگار کی تلاش تھی وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ شگفتہ نگار ہر جگہ موجود دیکھا جو حیرتوں کی اصلی رنگوں میں کاغذ پر اُتارنے کا فن جانتا ہے۔

نام کتاب: عشق بدوش/شاعر:حسن عباس رضا/صفحات: 168 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار:شمیم حنفی
ناشر: دوست پبلی کیشنز، لاہور

---

تاریکی، تشدد اور تنگ نظری کی مجموعی فضا میں محبت کی باتیں کرنا بھی احتجاج اور مزاحمت کی ایک شکل ہے۔ظاہر ہے کہ ہمارا زمانہ اس کے لیے ساز گار نہیں۔ شاید اسی لیے حسن عباس رضا کی غزلوں میں عشقیہ تجربے اور طرز احساس کے ساتھ ساتھ مجھے فکر کی ایک نئی اور منفرد جہت سے روشناس ہونے کا موقع بھی ملا اور ان کا کلام پڑھنا مجھے بہر حال بہت اچھا لگا۔ان کی غزلوں میں تازگی اور پختہ کاری کی ایک دلچسپ اور رنگا رنگ کیفیت بھی ملتی ہے۔وہ روایتی اور آزمودہ اسالیب کو بھی ایک نئی سطح پر برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور بہ ظاہر پرانی زمینوں میں نئے شعر بڑی مہارت کے ساتھ نکال لیتے ہیں۔تقریباً تمام غزلوں میں ان کی انفرادیت کا رنگ بھی روشن ہے۔حسن عباس رضا کے کچھ شعروں اور زمینوں کی داد تو نہایت روایتی مزاج رکھنے والے اساتذہ بھی دیتے ہیں، امتحان اور آزمائش کے اس دور میں انہوں نے اپنے لیے ایک مشکل راستے کا انتخاب کیا ہے اور یہ راستہ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔

نام کتاب: چھوٹی چھوٹی نظمیں/شاعر:زاہد مسعود/صفحات: 104 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار:اعجاز کنور راجا
ناشر: بک ہوم، لاہور

---

زاہد مسعود ستر کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے چند باکمال شعراء میں سے ایک ہیں۔میں اُن کے ذوقِ مطالعہ اور تحقیقی شعور کا عینی شاہد ہوں اور قدم قدم اُن کے ساتھ رہا ہوں۔احساس، فکر اور عصری شعور اُن کی شعری کائنات ہیں۔غزل ہو، نظم ہو، نثر ہو وہ اپنی اس کائنات میں اپنے پورے قد کے ساتھ موجود ہیں۔خصوصی طور پر نثری نظم کے حوالے سے وہ بلاشبہ سر فہرست ہیں۔اُن کا نام ادبی حوالوں میں ایک معتبر، متحرک اور سدا بہار شخصیت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ قومی ایوارڈ تمغہ حسن کارکردگی اور اس کے علاوہ اُن کی پنجابی اور اُردو تخلیقات پر دیگر قومی ایوارڈز میرے اس دعوے پر دلیل ہیں۔وہ چھوٹے چھوٹے نظر انداز کر دیے جانے والے رویوں اور مسائل کو انتہائی خوبصورت اور پراثر انداز میں اُجاگر کرنے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔

زیر نظر مجموعہ کلام جو مختصر نظموں پر مشتمل ہے۔اپنے اندر ایسے ہی بے شمار عمومی طور پر نظر انداز کر دیے گئے۔واقعات اور مسائل کا خوبصورت بیانیہ لیے ہوئے ہے جو الفاظ کے شاندار چناؤ، ترتیب اور حسن کلام سے مزین ہے اور اُس پر سند ان نظموں کے عنوانات ہیں جو اُن کی تفہیم میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سرخ زمینوں پر سبزہ بکھیرتی نظمیں نوجوان نسل کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نام کتاب: نمایاں/شاعر:افضل گوہر/صفحات: 128 / قیمت: 250روپے/تبصرہ نگار:محمد اظہار الحق
ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد

---

ہم کو تو اُس نے پیاس بھی دریا مثال دی  پہلے بدن میں ریت بھری پھر نکال دی

افضل گوہر کا یہ شعر پڑھا اور میں حیران ہوا کہ کیا خارج اور کیا اندر! سب منجی پیڑھی ٹھوکنے اور پھیری لگانے والے نام نہاد نقادوں کے کند، بیکار اوزار ہیں۔افضل گوہر نے اس شعر میں خارج اور اندر، ظاہر اور باطن، عشق اور حسن، غم دُنیا اور غم یار سب کچھ سمیٹ کر اور لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔

کتنے ہی الماس اور مرجان ہیں جو ہمارے قریوں اور قصبوں میں چمک رہے ہیں! جوہری ہیں کہ انہیں بڑے شہروں سے فرصت ہی نہیں۔

افضل گوہر نے ہجوم میں اپنی شناخت کو الگ کر لیا ہے۔غزل کہہ رہا ہے اور ایسی کہ دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنا پڑتی ہے۔الفاظ بے حد سادہ! مضامین محبت کے بھی اور زندگی کے بھی! غزل کی جان، تغزل کے طائر میں ہے۔زمینیں بے شک آسمان سے لے آئیں، مضامین کیوں نہ زمین کی تہہ سے نکالے گئے ہوں، تغزل نہیں تو سب بیکار ہے۔غزل نرماہٹ مانگتی ہے اور ناز برداری! اور اس فن میں افضل گوہر طاق ہے! خدا اسے سلامت رکھے تا کہ وہ یہ آسمانی شال بنتا رہے!

نام کتاب: روبرو محبت ہے/ شاعر: نوید مرزا/ صفحات: 144 / قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: مقصود عامر

ناشر: رحمانیہ کتاب مرکز، لاہور

''روبرو محبت ہے'' نوید مرزا کا تیسرا مجموعہ کلام ہے، جو اپنی تقریب رونمائی سے پہلے ہی منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہو کر سند حاصل کر چکا ہے۔میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھے ہر شعر پر لطف لینے کے لیے کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔کیوں کہ ہر شعر انفرادیت اور جاذبیت کے حوالے سے منفرد تھا۔اشارے، استعارے، کنایے اور لفظوں کی بنت کاری کمال اوج پر تھی۔نوید مرزا شعر برائے شعر نہیں کہتا ہے بلکہ اس نے ثابت کیا ہے کہ شاعری کیا ہے۔شاعری نام ہے انداز کا۔آپ بات کیا کہتے ہیں یہ شاعری نہیں بلکہ آپ بات کیسے کہتے ہیں یہ شاعری ہے اور نوید اس میں کامیاب رہا۔اس نے جو بات بھی کی بڑے سلیقے سے کی۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے کہ:

آنکھوں کا لہو دل کی طرف کر گیا ہجرت — یہ زہر مرے جسم سے باہر نہیں آیا

گو کہ نوید مرزا نے اپنی اس کتاب میں ہر طرح کے خیال پر طبع آزمائی کی ہے۔مگر محبت اس کا پسندیدہ موضوع سخن ہے اور نفرت وہ کسی سے کرتا نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس نے دنیا کے ہر کام پر محبت کو ترجیح دی ہے۔اس حوالے سے ایک شعر دیکھیے گا:

میں آئینہ ہوں مرے روبرو محبت ہے — جہاں پہ میں ہوں وہاں چار سُو محبت ہے

**خالد مسعود/ لاہور**

دبی دبی سی یہ آشفتگی قیامت ہے
کسی کے ساتھ مری دل لگی قیامت ہے
رہے گی حُسنِ پریشاں کی یہ پریشانی
دلِ حزیں تری آزردگی قیامت ہے
نہیں ہے شکوہ کسی کی بھی سرد مہری کا
تری طرف سے یہ بیگانگی قیامت ہے
کہیں کھلی کہیں پردے میں یہ چھپی نفرت
فریب و مکر کی یہ زندگی قیامت ہے
فریفتگی کا وہ انداز اُن پہ ہے اے دل
کہیں وہ بزم میں دیوانگی قیامت ہے
ہے حشر نازکی، فتنہ ہے تازگی اُن کی
فقط یہی نہیں رخشندگی قیامت ہے
کہ دعویٰ اپنا بھی مسعودؔ ہے محبت کا
مگر خدا کی بھی وارفتگی قیامت ہے

**خالد مسعود/ لاہور**

ہے شوخی حشر تو افسردگی قیامت ہے
شبابِ حُسن کی دوشیزگی قیامت ہے
غضب ہے حسنِ سخن کا کلامِ شیریں بھی
ادائے ناز کی بے ساختگی قیامت ہے
چمن کے پھول ہوں یا پھر جہاں کی وسعت ہو
ہماری آنکھوں کی حیرانگی قیامت ہے
ہر ایک شے کا ہے اوجِ کمال پر جلوہ
مرے خدا کی بھی یکتائگی قیامت ہے
دلِ حزیں کی ہیں بے تابیاں اُدھر توبہ
اِدھر تو شوخ کی بیگانگی قیامت ہے
یہ عشق وادیٔ وحشت میں ہے قدم رکھنا
سُرور و مستی کی وارفتگی قیامت ہے

ہر اک محاذ پہ قسمت میں کیوں ہزیمت ہو
چمن کے گوشے میں ویرانگی قیامت ہے
وطن گلابوں سے مہکے گا ایک دن اپنا
چمن کی مٹی کی تابندگی قیامت ہے
وہ رُوبرو مرے آ کے گفتگو کے وقت
کھڑے ہیں ایسے کہ شرمندگی قیامت ہے
اے میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر دے
کہ مصلحتوں کی یہ فرزانگی قیامت ہے
پڑے ہوئے ہیں جو غیروں کی ٹھوکروں پر ہم
مرے وطن کی یہ درماندگی قیامت ہے
یہ سب نشانیاں مسعودؔ ہیں قیامت کی
کہ چار سو ہے جو پژمردگی قیامت ہے

# نامہ ہائے احباب

برادرم حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم! محترم عامر بن علی صاحب اور آپ کا پرچہ ارژنگ مجھے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اس عنایت کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ارژنگ کے لیے اپنی دو تازہ اور غیر مطبوعہ غزلیں ارسال خدمت ہیں۔ شاید پسند آجائیں اور کسی آئندہ شمارے کے کسی کونے میں جگہ پا سکیں۔ خدا کرے آپ دونوں مدیر بہمہ وجوہ بخیریت ہوں۔

''ارژنگ'' مجھے اچھا لگتا ہے آپ خیر اندیش واقعی محنت سے اسے بناتے اور سنوارتے ہیں۔

روحی کنجاہی/لاہور

محترم حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم! ایک غزل برائے ''ارژنگ'' اشاعت کے لیے ارسال خدمت ہے۔ کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے دیجیے مہربانی ہوگی۔ یاد دہانی کے طور پر لکھ رہا ہوں آپ نے چند دوستوں کے فون نمبر بھیجنے تھے اگر ہو سکے تو بھیج دیں۔ عامر بن علی کے لیے معصوم شکریہ

نصرت صدیقی/فیصل آباد

برادرم حسن عباسی!

سلام مسنون۔ بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ارژنگ میں میرا مضمون شائع کیا۔ مجموعی طور پر ارژنگ ایک عمدہ جریدہ ہے جس میں ادبی حوالے سے کافی مواد مل جاتا ہے۔ حال ہی میں نے کچھ ادبی جرائد کے بارے میں روزنامہ پاکستان میں ادبی کالموں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کے ایک کالم میں ارژنگ بھی شامل تھا۔ اس کالم کی ایک فوٹو کاپی آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔

نسیم سحر/اسلام آباد

برادر مکرم!

سلام مسنون۔ ماہ نامہ ''ارژنگ'' کا نقش تازہ موصول ہوا۔ آپ مجھے اس قدر محبت سے نوازتے ہیں، یہ آپ کی وضع داری ہے۔ ورنہ کس قابل ہوں۔ ''ارژنگ'' کے مندرجات اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ آپ نے اس رسالے کو ہر درجہ کے شاعر اور ادیب کے لیے قابل کشش بنا دیا ہے۔ اس پر داد اور تحسین قبول فرمایئے۔ ان دنوں ساہیوال کی فضاؤں میں سرد مہریوں کی گھٹا برس رہی ہے۔ ہم جیسے معتکف لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ گزشتہ دنوں ہم دم دیرینہ اور خوب صورت شاعر (جن کا مجموعہ کلام آپ نے شائع کیا) جناب غضنفر عباس سیّد برین ہیمبرج کا شکار ہوئے۔ تا حال ہسپتال میں داخل ہیں۔ احباب خاصے فکر مند ہیں۔ وہ تو میرے کالج کے رفیق کار اور میرے شعبے میں ہمراہ ہیں۔ احباب سے ان کی صحت کی دعا کی درخواست ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین

افتخار شفیع/ساہیوال

جناب حسن عباسی صاحب!

آداب! اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ارژنگ موصول ہو گیا۔ بے حد شکریہ۔ مجھے یاد نہیں کہ خط لکھا تھا یا نہیں۔ بہر حال پرچے کی رسید حاضر ہے اور ایک عدد نظم بھی ارژنگ کے لیے ارسال خدمت ہے۔

افسانے بہت پسند آئے اور لبنیٰ صفدر کی کاوشیں بہت عمدہ ہیں۔

آسناتھ کنول/لاہور

جناب عامر بن علی صاحب/حسن عباسی صاحب

اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ یہاں لائبریری میں ارژنگ گاہے بہ گاہے نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ گزشتہ شمارے میں تفاخر محمود گوندل کے گوشہ نعت نے آنکھیں بھگو دیں۔ بہت عمدہ نعتیہ شاعری تھی۔ ڈاکٹر مختار عزمی کا مضمون، عامر بن علی کے سفرنامے کے حوالے سے لبنیٰ صفدر کا مضمون قابل مطالعہ تھے۔ افسانوں میں انیلہ بھلر اور ایوب صابر کے علاوہ محمد حسنین صابر کے افسانے ''آتشِ عشق'' نے بہت متاثر کیا۔ ارژنگ ایک اچھا اور معیاری ادبی پرچہ ہے۔ ڈھیروں دُعائیں

گل جہان/ایبٹ آباد

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ

# ارژنگ

لاہور

Monthly
Arxang
Lahore

## پاکستان اور دنیا بھر کے اہل ادب کا ترجمان میگزین

## اعلیٰ ادبی و صحافتی روایت کا امین

مدیر اعلیٰ ❀ عامر بن علی مدیر ❀ حسن عباسی

### ادبی سلسلے

حمد و نعت

شاعری

افسانے

تبصرۂ کتب

سفرنامے

انشائیے

آپ بیتی

شعری گوشے

تراجم

نامہ ہائے احباب

تنقید و تحقیق

عالمی شاعری

طنز و مزاح

نامور ادبی شخصیات کے دلچسپ انٹرویوز

مختصر ادبی خبریں

ماہنامہ ارژنگ کے سالانہ ممبر بن کر ادب کے فروغ میں ہمارا ساتھ دیں

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ مبلغ ایک 1000 روپے بیرونِ ملک 5000 روپے

ماہنامہ ارژنگ میں اشتہارات کی بکنگ کے نرخ

| تفصیل | برائے ایک شمارہ | برائے تین شمارے | برائے چھ شمارے |
|---|---|---|---|
| مکمل صفحہ رنگین | 5000 روپے | 15000 روپے | 30000 روپے |
| آدھا صفحہ رنگین | 3000 روپے | 9000 روپے | 18000 روپے |
| مکمل صفحہ بلیک اینڈ وائٹ | 3000 روپے | 9000 روپے | 18000 روپے |
| آدھا صفحہ بلیک اینڈ وائٹ | 2000 روپے | 6000 روپے | 12000 روپے |

ماہنامہ ارژنگ کی سالانہ ممبر شپ اور اشتہار کے لیے ابھی رابطہ کریں

0300-4489310-0331-4489310 nastalique786@gmail.com

دفتر: F/3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار لاہور، 54000 پاکستان

ممتاز شاعرہ اور کالم نویس

# ڈاکٹر صغریٰ صدف

کے شعری مجموعے

# وعدہ

کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

عمان (مسقط) میں مقیم نوجوان شاعر

# قمر ریاض

کے پہلے شعری مجموعے جیون، تتلی اور میں کا دوسرا ایڈیشن
اشاعت کے مراحل میں

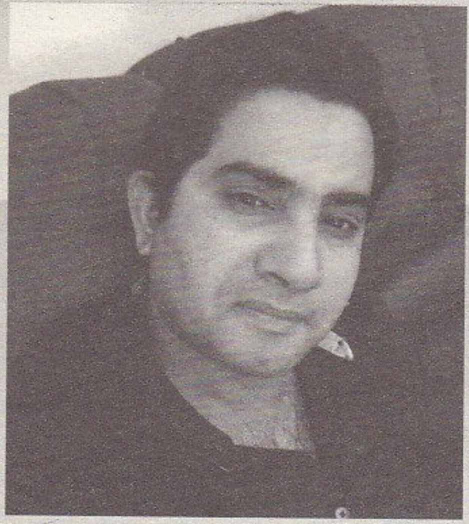

عشق میری حیات ہو جیسے
یہی کل کائنات ہو جیسے
وہ سمجھتا ہے بھول جانا مجھے
عام سی کوئی بات ہو جیسے
ایسا لگتا ہے زندگی کا سفر
کوئی لمبی سی رات ہو جیسے
دل کے یوں ٹوٹنے سے لگتا ہے
ہو گئی میری مات ہو جیسے
میں کہاں اور وہ کہاں ہے قمرؔ
پھر بھی لگتا ہے ساتھ ہو جیسے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

## جب ہم شخصیات کے خلاف مہم کو قوموں کے خلاف مہم میں تبدیل کر دیتے ہیں تو ملک خلاف ہو جاتے ہیں

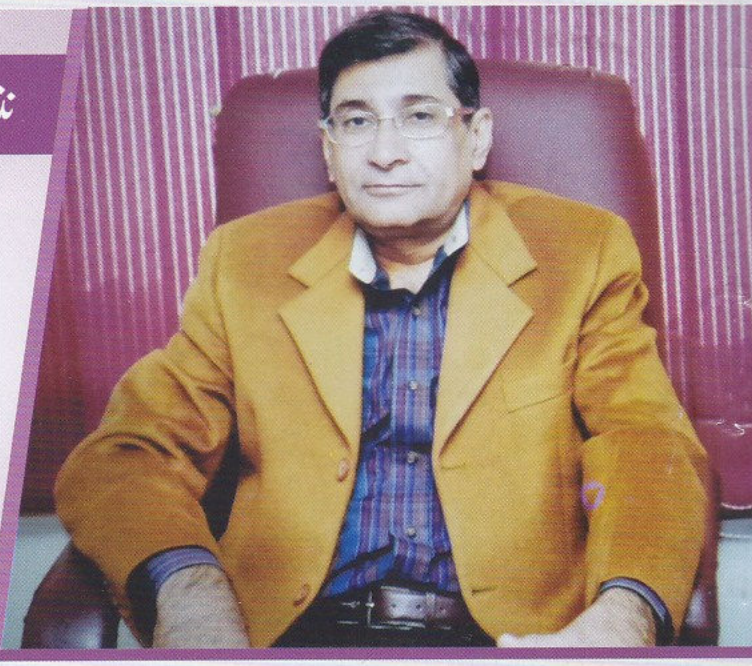

نذیر ناجی صاحب نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔

## شاعری کا بھوت بے وزن شاعری کر کے اپنے سر سے اتارا۔

واپڈا، فائیو سٹار ہوٹلوں، ثانوی تعلیمی بورڈ اسٹیٹ لائف اور لیسکو کے خلاف کیسز جیتے

# نامور صحافی اور ادیب صہیب مرغوب سے

لبنیٰ صفدر کی گفتگو

● بچپن، تعلیم اور ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتائیں۔

● گنگا رام بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر 5,4 فلیٹس تھے۔ ان میں سے ایک تھا۔ 27 جنوری 1960 کو پیدا ہوا۔ 2007 تک اُسی بلڈنگ میں رہائش پذیر رہے۔ ایف سی کالج سے ایف ایس سی کیا۔ گریجویشن پرائیویٹ کیا۔ باقی تعلیم بھی پرائیویٹ کی۔ کیونکہ یونیورسٹیوں میں وقت ضائع ہوتا تھا۔ پیدل چلنے کا بہت شوق تھا۔ بچپن سے اسکول اور کالج گھنٹوں کا راستہ...... پیدل چل کر جایا کرتا تھا۔ بچپن پاک بھارت جنگ میں گزرا۔ 1960 میں پیدا ہوا تو 65 میں جنگ ہوگئی۔ سائرن بجتے تو سیڑھیوں میں جا کر بیٹھ جاتے۔ چھ سال بعد اکہتر میں پھر جنگ ہوگئی۔ 1971ء کی ان دو جنگوں میں بچپن گزرا۔ چنے اور گڑ کھا کے۔

● صحافت کی طرف حادثاتی طور پر آئے یا منصوبہ بندی کے تحت؟

● دو تین چیزیں مجھ میں پیدائشی طور پر ہیں۔ مثلاً میں ہر کام کی باریکیوں میں چلا جاتا ہوں۔ کھوج لگانے اور جستجو کی عادت بچپن سے تھی۔ اس زمانے میں شاعری کا جنون ہوا۔ اپنی طرف سے زبردستی شاعری کی۔ بھٹو صاحب پر کتاب مرتب کی۔ صفدر ہمدانی پروڈیوسر تھے۔ مسعود منور صاحب سے پیش لفظ لکھوایا۔ مسعود منصور صاحب نے ریمارکس دیے کہ انتہائی بے وزن شاعری ہے لیکن خیالات اچھے ہیں۔ سکول کے زمانے میں والد صاحب ریڈیو اور ٹی وی پر ٹاکس کیا کرتے تھے تو انہوں نے ساتھ لے کر جانا، اسٹیشن ڈائریکٹر ہوتے تھے راحت کاظمی صاحب، تو میں نے ریڈیو پر پروگرام کرنا شروع کیا جب میں ساتویں کلاس میں ہوتا تھا۔ ایف سی کالج میں یونیورسٹی میگزین پروگرام شروع کیا۔

شاعری کا بھوت بے وزن شاعری کر کے اپنے سر سے اُتارا۔ اس کتاب کو میں نے چھاپا بھی۔ مختلف اسٹالز پر جا کے رکھوایا بھی۔ جب مختلف اسٹالز پر رکھوایا اس کے بعد جنرل ضیا صاحب نے نثری تقریر میں سنسر شپ عائد کر دی، ایسے لٹریچر پر پابندی عائد کر دی۔ میری کتاب کا کیا بنا۔ یہ کالج کے دنوں کی بات ہے۔ ریڈیو پر یونیورسٹی پروگرام صفدر ہمدانی کے پاس تھا۔ میں نے ایک بے وزن غزل لکھی۔ اس کے 7 شعر تھے۔ ہمدانی صاحب نے اس کو وزن میں ڈھالا۔

زندگی کا درد آنکھوں میں اُتر کر آ گیا
بستیوں پر آنسوؤں کا کون مینہ برسا گیا

میرے سات شعر تھے ہمدانی صاحب نے 5 واپس کیے۔ میں نے کہا یہ میرے دو شعر پی گئے ہیں۔ جب فائنل ریکارڈنگ تھی میں نے پوری غزل ری رائٹ کی۔ اُس میں وہ دو شعر بھی ڈال دیے۔ تبسم کاشمیری صاحب پروگرام کے میزبان تھے۔ میرے ساتھ یونیورسٹی کے دو اور نوجوان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے تیسرے نمبر پر ایک شعر گھسایا ہوا تھا۔ جب میں نے وہ شعر پڑھا تھا تو لائٹ بند ہوگئی اوپر سے۔ میں نے تبسم کاشمیری کی طرف دیکھا تو وہ بے بسی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے کہا یہ کیسے آ گیا۔ میں نے کہا اس پہ پانی گر گیا تھا۔ اس لیے ری رائٹ کر لی غزل۔ انہوں نے کہا اس میں یہ دو شعر تو نہیں تھے۔ بعد میں انہوں نے کہا یہ نہیں پڑھنی۔ بے وزن شاعری کا کافی کریڈٹ جاتا ہے مجھے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

نامور ادیب، معروف شاعر اور معروف کالم نگار عامر بن علی کی کتب کے
دیدہ زیب اور اعلیٰ معیار کے

# تازہ ایڈیشن

شائع ہو کر پاکستان کے تمام اہم کتب خانوں پر دستیاب ہیں

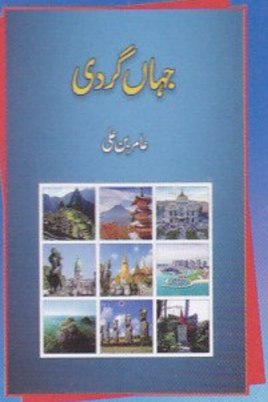


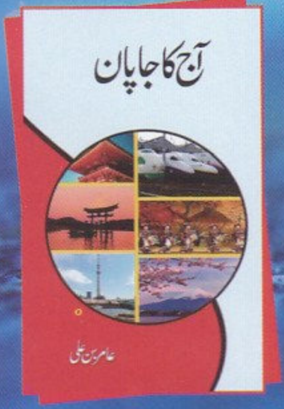


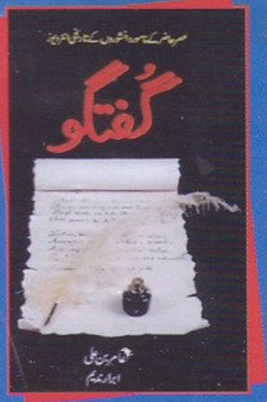


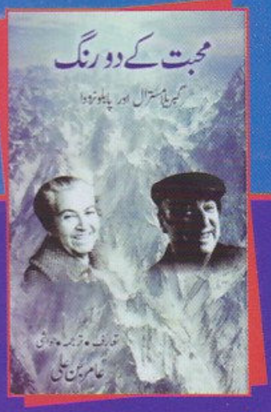


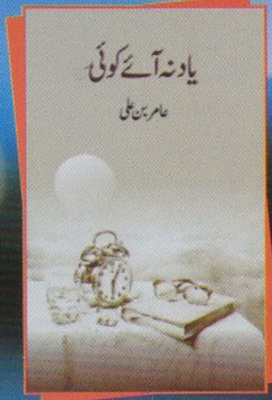


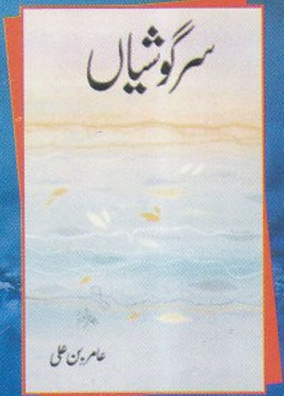


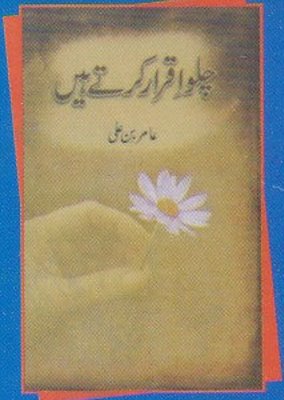


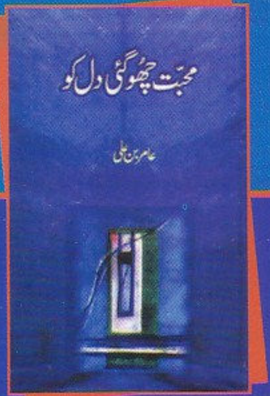

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.
(Express Tribune Book Review)

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through his writings.
(Daily The Nation Book Review)

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull